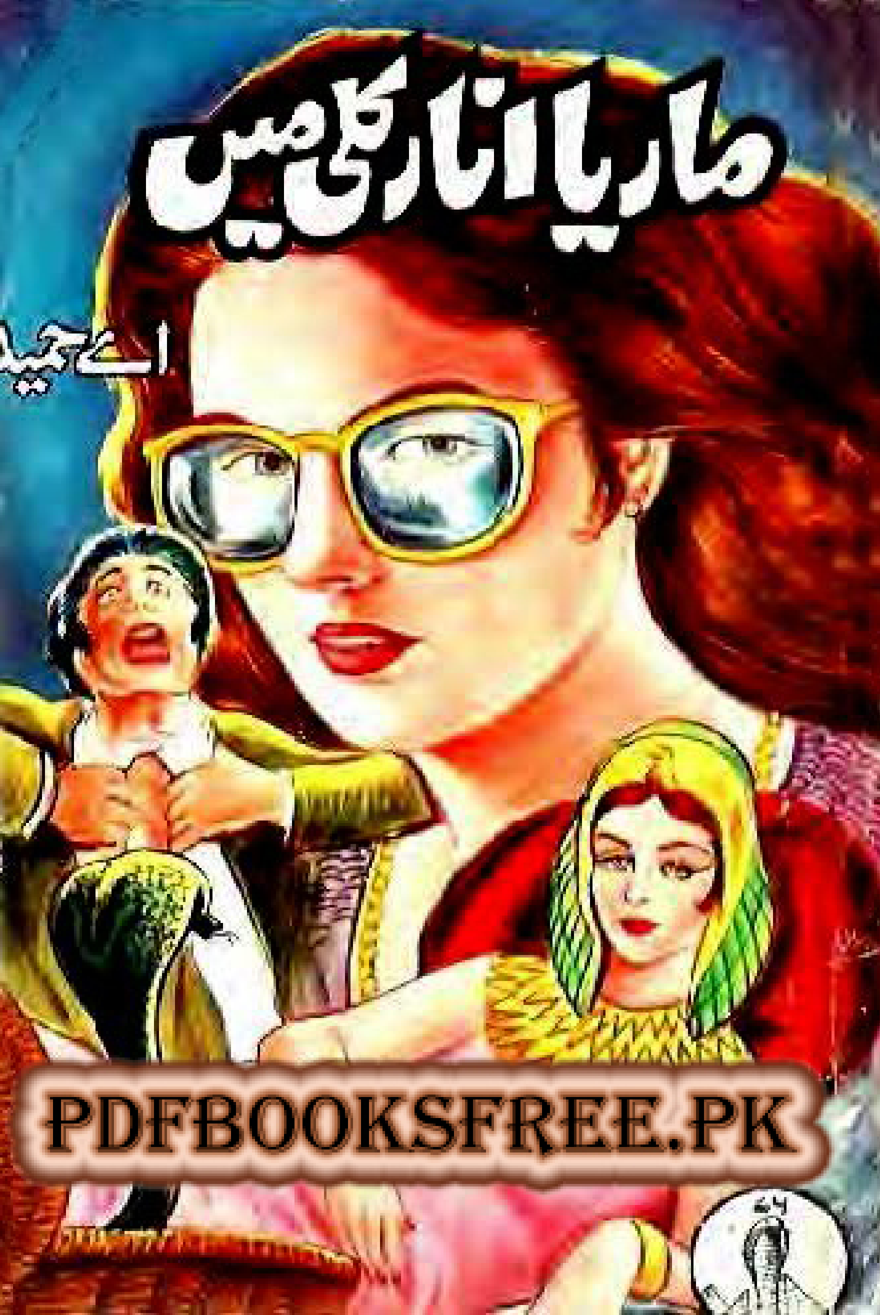

مارا انارکلی میں

اے حمید

لاہور کی لڑکی ــــ قلوپطرہ کی خوابگاہ میں

لاہور کالج کی لڑکی شیبا۔ عنبر کے ساتھ اندر چلی گئی۔

عنبر ڈرائینگ روم میں بیٹھ گیا اور شیبا نے الماری میں سے "عنبر ناگ ماریا کی واپسی" کی چھ سات کتابیں لا کر اس کے سامنے رکھ دیں اور کہنے لگی۔

"کیا تم نے اپنے پانچ ہزار سالہ سفر کی تازہ کتابیں پڑھی ہیں عنبر؟"

عنبر نے کہا۔

"شیبا! پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی کے سامنے مجھے زیادہ میرے نام عنبر سے نہ پکارنا۔ کیونکہ تمہارے ساتھ ایک ایسا حادثہ یا اتفاق ہو گیا ہے کہ مجھے تم پر اپنا آپ ظاہر کرنا پڑ گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے "عنبر ناگ ماریا کی واپسی" کی کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔"

شیبا بولی۔

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم نے مجھ پر اپنا آپ ظاہر کر دیا ہے۔ کیونکہ میری بڑی خواہش تھی کہ میں تم میں سے

کسی ایک سے کبھی ملاقات کروں ——— تمہاری قسطیں پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اسی شہر لاہور کے گارڈن ٹاؤن میں دسویں جماعت کا ایک لڑکا ہے جس کا نام امجد ہے وہ تم لوگوں سے نہ صرف مل چکا ہے بلکہ تمہارے ساتھ تاریخ کے پرانے زمانے میں سفر بھی کر چکا ہے۔ میں امجد سے ایک بار ملی مگر اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ تم میں سے کسی سے کبھی نہیں ملا ہے۔ وہ اس بات کو راز رکھنا چاہتا تھا“

عنبر نے مسکرا کر کہا۔

”یہ اس نے ہمارے عہد کو نبھایا ہے۔ کیونکہ ہم کسی پر اپنا راز ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ ہاں ——— کوئی ایسا حادثہ نہ ہو جائے جیسا کہ تمہارے ساتھ ہوا کہ تمہارے سامنے میرے سینے میں گولی لگی اور پھر تمہیں سانپ نے کاٹ لیا اور میں نے تمہارے سامنے سانپ کو حکم دیا کہ وہ تمہارا زہر واپس چوس لے ———“

شیبا کہنے لگی۔

”بہر حال خدا نے میری دعا قبول کر لی اور ماریا اور ناگ سے نہیں تو عنبر سے ملاقات ہو گئی“

عنبر نے کہا۔

”اب تم بھی وعدہ کرو کہ اس کا ذکر کسی سے نہیں کرو

گی کہ تمہیں سانپ نے کاٹا تھا اور میرے بارے میں بھی کسی کو نہیں بتاؤ گی ———

”میں وعدہ کرتی ہوں“ شیبا نے کہا۔

عنبر کتابوں کے ورق الٹ الٹ کر دیکھ رہا تھا اور کہیں کہیں سے ایک آدھ سطر پڑھ بھی لیتا تھا۔ شیبا نے کہا۔

”اب میں تم سے پھر وہی سوال پوچھتی ہوں، تمہارے سفر کے جو واقعات ان کتابوں میں درج ہیں کیا وہ سارے سچے واقعات ہیں؟“

عنبر نے کہا۔

”ہاں ——— بالکل سچے واقعات ہیں اور اس کا مصنف اے حمید ٹھیک ٹھیک واقعات لکھ رہا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ سمن آباد دراہِ چمن میں رہتا ہے اور وہ ہمارا دوست ہے۔

ہم اسے اپنے سفر کے پُر اسرار واقعات ایک خفیہ طریقے سے بتا دیا کرتے ہیں اور ایک بار ناگ نے مل کر اسے کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے ہمارے واقعات کو غلط لکھا تو تمہاری خیر نہیں ہے ———“

شیبا مسکرانے لگی۔ بولی۔

”وہ کون سا پُراسرار طریقہ ہے جس سے تم اے حمید

کر اپنے سفر کے واقعات بتاتے ہو؟"
عنبر نے کہا۔

"یہ ایک راز ہے جو ہم اس وقت تک کسی کو نہیں بتا سکتے جب تک کہ ہمارا یہ پانچ ہزار سالہ سفر ختم نہیں ہو جاتا——؟"
شیبا نے پوچھا۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری ایک انگلی میں سرخ یاقوت کی انگوٹھی ہے۔ کیا یہ وہی انگوٹھی ہے جس کا ذکر پچھلی قسطوں میں تھا کہ تم اسے چاندنی رات میں رگڑ کر اس کے اندر جو منظر نظر آتا ہے اس میں چھلانگ لگا کر غائب ہو جاتے ہو؟"

"ہاں" عنبر نے کہا۔

"تم نے ٹھیک پڑھا تھا۔ یہ وہی انگوٹھی ہے۔ مگر تم اسے رگڑنے کی غلطی نہ کرنا۔ امجد نے ایک بار یہ غلطی کی تھی اور اسے بڑا سخت نتیجہ بھگتنا پڑا۔"
شیبا نے انگوٹھی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں عنبر بھائی—— میں ایسی غلطی نہیں کروں گی۔"
شیبا نے "عنبر ناگ ماریا کی واپسی" کی کتابیں سمیٹ کر الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔

"عنبر۔ میں تاریخ کی سٹوڈنٹ ہوں۔ مجھے پرانے مصر اور یونان کی تاریخ سے بے پناہ محبت ہے۔ میں خواب میں

ان پرانے زمانوں کی سیر کیا کرتی ہوں۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ خود اپنی آنکھوں سے زندہ اور جاگتی حالت میں ان پرانے شہروں کی سیر کروں۔ کیا تم مجھے ان شہروں کی سیر کراؤ گے؟ میرا مطلب ہے کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم مجھے بھی امجد کی طرح اپنے ساتھ لے چلو پرانے مصر اور یونان اور بابل کے شہروں میں؟"

عنبر کے چہرے پر سوچ کے آثار پیدا ہو گئے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"شیبا! یہ سفر اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ تم سمجھ رہی ہو۔ اس میں کئی ایک خطرے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم تمہیں آج سے چار ہزار یا دو ہزار سال پرانے زمانے میں لے چلیں اور تم وہاں جا کر ہم سے بچھڑ جاؤ جس طرح کہ امجد بچھڑ گیا تھا۔ —— دوسری بات یہ ہے کہ ہم چونکہ صدیوں کے مسافر ہیں، اس لیے ہمارے ساتھ تو ایسا اتفاق ہو جاتا ہے کہ ہم اچانک کسی حادثے یا کسی ایک جھٹکے سے کسی بھی وقت پر اگلے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکو گی۔"
شیبا نے کہا۔

"عنبر بھائی! چاہے کچھ بھی ہو۔ میری زندگی کی یہ سب سے بڑی تمنا ہے کہ میں فرعون مصر کے محل میں پہنچ کر اپنی آنکھوں

سے فرعون کو تخت پر بیٹھے دربار کرتے دیکھوں اور قلوپطرہ کو دیکھوں کہ وہ سانپ سے اپنے آپ کو ڈسوا رہی ہے؟"

عنبر ہنسا۔

"فرض کر لو کہ تم ملکہ قلوپطرہ کے زمانے میں پہنچ جاتی ہو۔ لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتا کہ تم واپس لاہور بھی آسکو گی۔"

شیبا نے اداس ہو کر سر جھکا لیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ حسرت میں اپنے دل میں ہی لے جاؤں گی ——"

پھر اس نے ایک آہ بھری اور بولی۔

"اگر تم اتنی طاقت رکھتے ہوئے بھی مجھے ملکہ قلوپطرہ کے زمانے کی سیر نہیں کرا سکتے تو پھر اور کون کرا سکتا ہے ——"

شیبا کی اداسی عنبر سے نہ دیکھی گئی۔ لیکن وہ مجبور تھا اور کسی غیر آدمی یا عورت کو پرانے زمانے میں لیجانے کا زبردست خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں شیبا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا ——"

وہ اٹھ گیا اور بولا۔

"اچھا اب میں جاتا ہوں۔ ابھی میں لاہور میں ہی ہوں،

کیونکہ مجھے امجد سے ملنا ہے جو کوہ مری گیا ہوا ہے اور چند روز میں واپس آئے گا۔ ہو سکتا ہے میں اس دوران میں تمہیں ملنے پھر آؤں۔"

شیبا نے پوچھا۔

"اگر امجد لاہور میں نہیں ہے تو تم کہاں جاؤ گے! میرا مطلب ہے رات کہاں بسر کرو گے؟"

عنبر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔

"تم نے ہمارے پر اسرار سفر کی اتنی قسطیں اور کتابیں پڑھی ہیں مگر تمہیں ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ عنبر ناگ اور ماریا کو نہ تو کھانے کی حاجت ہوتی ہے اور نہ سونے کی۔"

شیبا کہنے لگی۔

"یہ تو میں خوب جانتی ہوں۔ لیکن پھر بھی رات تو تم ضرور کسی جگہ کاٹو گے؟"

عنبر بولا۔

"یہاں میرا ایک ہی شاہی محل ہے جہاں میں راتیں بسر کیا کرتا ہوں اور وہ ہے مقبرہ جہانگیر۔ اب بھی میں وہیں جاؤں گا۔"

شیبا کے ذہن میں ایک سکیم مچل رہی تھی۔ اس نے بڑا اداس منہ بنا کر کہا۔

"عنبر بھائی! کیا تمہاری بہن کو اتنا بھی حق نہیں ہے کہ تم اس کے گھر رات بھر آرام کر سکو؟"

عنبر کا دل پسیج گیا۔ کہنے لگا۔

"اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو پھر میں تمہارے ہاں ہی رات بسر کر لیتا ہوں مگر میں چھت پر سوؤں گا۔ میرا مطلب ہے کہ میں اکیلا چھت پہ لیٹوں گا"

شیبا خوش ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"میں تمہارا بستر چھت پر ہی لگوا دوں گی"

دوپہر کا کھانا شیبا، اس کے والد جو واپڈا کے افسر تھے اور والدہ اور دوسری چھوٹی بہنوں اور بھائیوں نے مل کر کھایا۔ شیبا کی بہنیں اور بھائی عنبر سے پوچھتے رہے کہ وہ کون سے کالج میں پڑھتا ہے اور تاریخ میں کیا کیا اسے پسند ہے۔ کیونکہ عنبر نے ان سب کو یہی بتایا تھا کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا ہے اور ہوسٹل میں ہی رہتا ہے۔

برسات کا موسم تھا۔ اگرچہ آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد عنبر ان سب گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ شیبا نے نوکر سے کہا کہ عنبر کا بستر چھت پر لگوا دیا۔

دس بجے رات عنبر سونے یا لیٹنے کے لیے چھت پہ چلا گیا۔ پلنگ پر سفید چادر بچھی تھی اور سرہانے موتیے کے پھولوں کے ہار

رکھے ہوئے تھے۔ عنبر کو موتیے کے پھولوں کی خوشبو بڑی پسند تھی اور اس کو مدہوش کر دیا کرتی تھی۔ وہ بستر پہ لیٹ گیا تو موتیے کی میٹھی خوشبو میں اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ عنبر کو چونکہ وہاں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اگر موتیے کی خوشبو کی وجہ سے وہ مدہوش بھی ہو گیا تو کوئی پروا نہیں۔ چنانچہ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

گیارہ بجے کے بعد عنبر کو موتیے کے سفید پھولوں کی مہک نے مدہوش کر کے گہری نیند سلا دیا تھا۔ شاید کئی ہی سینکڑوں سالوں کے بعد عنبر کو پہلی بار گہری نیند آئی تھی ——— ادھر شیبا بھی اپنے کمرے میں جاگ رہی تھی اور خدا سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ یا خدا! عنبر کو نیند آ جائے اور تھوڑی دیر کو چاند نکل آئے۔ وہ چاند کی سترہ تاریخ تھی مگر بادلوں نے چاند کو ڈھانپ رکھا تھا۔

شیبا آہستہ سے پلنگ پر سے اٹھی اور دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پہ آ گئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ عنبر اپنے بستر پہ بالکل مدہوش ہو کر سو رہا ہے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک جگہ سے بادل پھٹ گئے تھے اور چاند آہستہ آہستہ اپنا منہ باہر نکال رہا تھا۔

شیبا دبے پاؤں چلتی ہوئی عنبر کے پلنگ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ عنبر کا ہاتھ پلنگ سے نیچے لٹک رہا تھا اور اس کی انگلی میں سرخ یاقوت کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ شیبا نے چاند کی طرف دیکھا۔ وہ بادلوں

سے باہر نکل رہا تھا۔ جب وہ بادلوں سے نکلا تو تھوڑی دیر کے لیے اس کی چاندنی ساری چھت پر پھیل گئی۔

شیبا اب دیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے عنبر کی انگوٹھی والی انگلی کو ایک ہاتھ سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے انگوٹھی کے یاقوت کو رگڑنے لگی۔ اس نے دل میں خدا سے یہ دعا مانگ لی تھی کہ یا خدا اس انگوٹھی کو حکم دے دے کہ یہ مجھے کسی دوسری جگہ لے جانے کی بجائے سیدھی قلوپطرہ کے زمانے میں پہنچا دے۔

انگوٹھی کو رگڑنے کے بعد شیبا نے عنبر کی طرف دیکھا۔ عنبر کو موتیے کی خوشبو نے مدہوش کر رکھا تھا۔ پھر اس نے انگوٹھی کے نگینے کو دیکھا۔ یاقوت پر رڈوی کی لکیریں آ رہی تھیں۔ شیبا کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگرچہ وہ ہزاروں برس پیچھے کے زمانے میں جا رہی تھی لیکن اتنا اس نے عنبر ناگ ماریا کی کتابوں میں پڑھ رکھا تھا کہ جب امجد عنبر یا ناگ کے ساتھ پرانے زمانے میں گیا تھا تو وہاں وہ دو برس تک رہا مگر جب لاہور واپس آیا تو وہاں لے گئے ہوئے صرف دس منٹ ہی گزرے تھے۔ اس خیال سے شیبا کو بھی تسلی تھی کہ وہ گھر سے غائب ہو کر قلوپطرہ کے زمانے میں پہنچ بھی گئی تو جب واپس آئے گی تو دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے اور وہ دوبارہ بستر پہ لیٹ کر سو جائے گی۔

لیکن یہ اس کی سب سے بڑی بھول تھی۔ کیونکہ امجد کے ساتھ ہی ایک بار ایسا بھی ہوا تھا کہ جب وہ پرانے زمانے سے واپس آیا تو لاہور میں اسے ایک مہینہ گزر چکا تھا اگر شیبا غائب ہو گئی اور پیچھے ایک مہینہ گزر گیا تو اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا کیا حال ہوگا؟ اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

انگوٹھی پر رڈوی کی لکیریں اب ختم گئی تھیں اور چاند بھی بادلوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ اگر چاند بادلوں میں چلا گیا اور چاندنی بجھ گئی تو پھر شیبا پرانے زمانے میں نہیں جا سکتی تھی۔

اس کی نظریں انگوٹھی کی لکیروں پر جمی ہوئی تھیں۔ عنبر ابھی تک مدہوش تھا ——— شیبا نے خدا سے دعا کی کہ اے خدا مجھے اپنی حفاظت میں لپنے عجب صورت پرانے زمانے کی سیر کرا دے۔ اور میں ایک بار اپنی آنکھوں سے ملکہ مصر قلوپطرہ کو دیکھ لوں۔

اس کے ساتھ ہی انگوٹھی کے یاقوت پر سے لکیریں غائب ہو گئیں اور اب ایک منظر ابھر آیا۔ کیا دیکھتی ہے کہ ایک دریا ہے جس کے کنارے کنارے پانی میں کنول کے سفید سفید بے شمار پھول کھلے ہوئے ہیں اور ایک پرانے زمانے کی لمبی گردن والی صراحی دریا کے کنارے کنول کے پھولوں کے پاس پڑی ہے۔

شیبا نے جیسا کہ عنبر ناگ ماریا کی واپسی کی قسطوں میں پڑھا تھا کہ عنبر کس طرح انگوٹھی میں غائب ہوا کرتا تھا، آنکھیں اپنے آپ

بند ہونے لگیں آنکھیں بند ہوتے ہی شیبا کو ایک جھٹکا سا لگا۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کار میں بیٹھی تھی اور کار ایک د سے چل پڑی ہے —— پھر اس نے اپنے پاؤں زمین سے او اٹھتے محسوس کیے۔ اب وہ ہوا میں اڑ رہی تھی اور خدا معلو کہاں جا رہی تھی۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے نیچے اتر رہی تھوڑی دیر کے بعد اس کے پاؤں زمین پر لگ گئے اور اسے ل جوتے بھی گھاس پر ٹکتے محسوس ہوئے۔ اس کی آنکھیں اپنے آپ کھل گئیں۔ کیا دیکھتی ہے کہ وہ اسی دریا کے کنارے کھڑی ہے ج دریا کو اس نے عنبر کی انگوٹھی میں دیکھا تھا۔

غروب ہوتے سورج کی سنہری روشنی دریا پر پڑ رہی تھی سب سے پہلی جو تبدیلی شیبا نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ اس کی فریم والی عینک اس کی آنکھوں پر سے غائب تھی اور اس کی نظ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ لاہور میں وہ عینک کے بغیر قریب ا دور کی چیزیں زیادہ صاف نہیں دیکھ سکتی تھی مگر یہاں اسے عینک کے بغیر بھی دور اور قریب کی چیزیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ اس کا لباس تین سال پرانے مصر کے لباس میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے پاؤ میں لاہور والی لبرٹی مارکیٹ سے خریدے ہوئے سینڈل کی جگہ مصری زمانے کا سینڈل تھا۔

وہ حیران تھی کہ وہ جو قدیم مصری زبان بول رہی ہیں اور اور جیسے وہ پوری طرح سمجھ رہی ہے کس قدر عجیب زبان ہے۔ وہ کسی دوسری زبان یعنی اردو، انگریزی، سندھی اور پنجابی سے بالکل نہیں ملتی تھی۔ کمال کی بات یہ تھی کہ شیبا یہ ساری زبان سمجھ رہی تھی اور خود بھی بول سکتی تھی۔

اسے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہ نہ صرف یہ کہ ملکہ مصر قلوپطرہ کے زمانہ میں آگئی ہے بلکہ قلوپطرہ کی خاص کنیز تھی اور اس کا نام شاریان تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس نے پڑھا تھا کہ ملکہ قلوپطرہ کی ایک خاص کنیز ہوتی تھی جس کا نام شاریان تھا اور اسی کنیز نے ملکہ کے حکم پر اسے وہ سانپ ٹوکری میں بند کر کے لا کر دیا تھا جس سے ڈسوا کر ملکہ قلوپطرہ نے خودکشی کر لی تھی۔

شیبا دوسری کنیزوں کے ساتھ شاہی محل کی طرف روانہ ہوئی۔

یہ محل قلعے کے اندر ہی تھا اور دریا قلعے کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہ مشہور تاریخی دریا —— دریائے نیل تھا!

شیبا قلعے میں داخل ہوئی تو اس نے پہرے داروں کو غور سے دیکھا۔ یہ پرانے مصر کے زمانے کے سپاہی تھے اور لوہے اور پیتل کے خُود سروں پر پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں نیزے تھے

اور سانولے رنگ کے اونچے لمبے آدمی تھے۔ شیبا دوسری کنیزوں کیساتھ قلعے کی ڈیوڑھی میں سے گزر کر شاہی محل کی طرف چلی جو قلعے کے درمیان میں واقع تھا اور جس کے سنہری گنبد اور مینار غروب ہوتے سورج کی سنہری کرنوں میں چمک رہے تھے۔

شیبا کے لیے یہ عجیب و غریب تجربہ تھا۔ لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری کے گھٹے ہوئے سرد کمرے میں بیٹھ کر اس نے پرانے مصر کی تاریخ کے قدیم شاہی محلوں کے بارے میں صرف پڑھا تھا اور اب وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا۔ اب وہ چاہتی تھی کہ جلدی سے جلدی ملکہ قلوپطرہ کا دیدار کرے اور اپنی آنکھوں سے اس عظیم الشان ملکہ کو دیکھے جس کا نام "تاریخ" میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا ہے۔

محل اتنا شاندار تھا کہ شیبا حیرت میں ڈوب گئی۔ اونچے اونچے سنگ مرمر کے ستون ـــــ سنگِ مرمر کی شہ نشینیں ـــ سنہری گنبد جن پر سونے کے پترے چڑھے ہوئے تھے۔ فرش پر بے حد قیمتی ریشمی قالین بچھے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ پہرے دار نیزے لیے کھڑے تھے۔ اور کنیزیں پھلوں اور خشک میووں اور کنول کے پھولوں سے بھرے ہوئے سونے چاندی کے طشت لیے چلی جا رہی تھیں۔ قلعے اور محل میں لگے ہوئے سخت پہرے کو دیکھ کر شیبا سمجھ گئی کہ شاہی محل اور ملکہ قلوپطرہ کو دشمن کے حملے کا خطرہ ہے۔

شیبا نے جلدی سے دریا کے پانی میں اپنا عکس دیکھا کہ کہیں اس کی شکل تو نہیں بدل گئی۔ خدا کا شکر تھا کہ اس کی شکل نہیں بدلی تھی۔ اس کے بال بھی پرانے زمانے کے فیشن کے بنے ہوئے تھے اور گول گول چھلے اس کے ماتھے پر لٹک رہے تھے۔ اس کے قریب ہی وہ صراحی پڑی تھی جسے اس نے عنبر کی انگوٹھی میں دیکھا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ انگوٹھی رگڑنے کے بعد خدا نے اس کی دعا سن لی تھی اور وہ لاہور سے نکل کر تین ہزار سال پیچھے کی طرف ملکۂ مصر قلوپطرہ کے زمانے میں آ گئی ہے۔ شیبا بہت خوش ہوئی۔ اسے ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ ایک خطرناک غلطی کر چکی ہے اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

کسی لڑکی نے اسے آواز دی۔

”شارلیان !“

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ تین لڑکیاں اسی طرح کا لباس پہنے کولہوں پہ پانی سے بھری ہوئی صراحیاں رکھے اسے بلا رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ یہاں اس کا نام شارلیان ہے اور یقیناً وہ ملکۂ مصر کے شاہی محل کی کنیز ہے۔ اب شیبا یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ کنیزیں جب اس سے قدیم مصری زبان میں کوئی بات کریں گی تو کیا وہ ان کی زبان سمجھ لے گی؟

شیبا کنیزوں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ ایک کنیز نے

تین ہزار سال پرانی مصری زبان میں کہا۔

”کیا پانی نہیں بھرو گی شاریان ؟“

اگر شیبا یہ زبان لاہور میں کسی کی زبان سے سنتی تو سر پیٹ پیٹ کر مر جاتی لیکن اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ مگر انگوٹھی کے ذریعے یہاں پہنچتے ہی وہ قدیم مصری زبان کو بڑی اچھی طرح سے سمجھنے لگی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یہ زبان بول بھی سکتی ہے۔ چنانچہ شیبا نے اسی زبان میں جواب دیا۔

”کیوں نہیں پانی بھرنا ــــ ابھی بھرتی ہوں“

اور شیبا نے کنول کے پھول پرے ہٹا کر صراحی کو دریا میں ڈبو کر اسے بھرا اور کمر کے ساتھ لگا کر سہیلیوں کے پاس چلی گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ وہاں کی جانی پہچانی اور سب سے اعلیٰ کنیز ہے اور برسوں سے شاہی محل میں رہ رہی ہے۔ کیونکہ کسی کنیز نے اس کی شکل کو دیکھ کر تعجب کا اظہار نہ کیا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آگئی ہے؟

وہ کھلا کھلا کر ہنسیں اور ایک کنیز نے کہا۔

”شاریان! تم ملکہ قلوپطرہ کی خاص کنیز ہو ناں۔ اس لیے شاید دریا کا پانی صاف کر کے بھرتی ہو“

شیبا نے کہا۔

”نہیں ایسی بات تو نہیں ہے“

تھی جو آپ کو بہت پسند ہے“

اتنے میں ایک خوب صورت نوجوان اندر داخل ہوا۔ جس کے بال گھنگریالے تھے اور جس نے جنگی لباس پہن رکھا تھا۔ کمر کے ساتھ خنجر لٹک رہا تھا۔

اسے دیکھ کر قلوپطرہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”انطنی! کوئی تازہ خبر آئی؟“

شیبا نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نوجوان کو دیکھا۔ تو یہ تھا مشہور رومی جرنیل انطنی جس کی قسمت میں تھوڑے دنوں بعد قلوپطرہ کے ساتھ ہی خودکشی کر کے مرجانا لکھا تھا۔

شیبا نے ”عنبر ناگ ماریا کی واپسی“ کی کتابوں میں پڑھ رکھا تھا کہ یہ لوگ تاریخ کے پرانے زمانوں میں سفر کرتے ہیں۔ گزرے ہوئے واقعات کو پھر سے گزرتے دیکھتے ہیں۔ مگر اس بات کی سختی سے پابندی کرتے ہیں کہ ان واقعات میں دخل نہ دیا جائے۔ مثلاً اگر قلوپطرہ نے تاریخ میں خودکشی کی تھی تو جب عنبر ناگ یا ماریا قلوپطرہ کے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں اور قلوپطرہ ان کی آنکھوں کے سامنے دوبارہ خودکشی کرتی ہے تو وہ اسے روک نہیں سکتے۔ کیونکہ اصل میں قلوپطرہ دوبارہ خودکشی نہیں کر رہی ہوتی بلکہ عنبر ناگ ماریا اسے خودکشی کرتے دوبارہ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ گویا ایسا ہوتا ہے کہ وہ گزرے ہوئے واقعات کی دوبارہ فلم چلتے دیکھتے ہیں اور اس فلم کے کسی واقعے

ہیں کسی قسم کا دخل نہیں دیتے۔

چنانچہ شیبا نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہرگز تاریخ کے کسی واقعے میں دخل نہیں دے گی۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ ہی دنوں بعد اس شاہی محل میں جب شہنشاہ روم کی فوجیں داخل ہو جائیں گی تو ملکہ قلوپطرہ اپنے آپ کو سانپ سے ڈسوا کر خودکشی کر لے گی۔ لیکن شیبا قلوپطرہ کو اس سے روک نہیں سکے گی۔ وہ اسے ہرگز ہرگز یہ نہیں کہہ سکے گی کہ ملکہ خودکشی مت کرو۔ کیونکہ قلوپطرہ کی خودکشی تاریخ کا ایک گزرا ہوا واقعہ تھا اور وہ تاریخ کے گزرے واقعے میں دخل نہیں دے سکتی تھی۔

جب ملکہ قلوپطرہ نے انطنی سے پوچھا کہ وہ کیا خبر لایا ہے تو وہ پلنگ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

قلوپطرہ — مجھے ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ شہنشاہ روم کی فوجیں ہمارے قلعے کے قریب پہنچنے ہی والی ہیں۔“

”انطنی تم فرار ہو کر بابل کی طرف نکل جاؤ۔ پیچھے جو ہوگا میں سنبھال لوں گی۔“

انطنی نے بھڑک کر کہا۔

”کیا تم مجھے ایک بزدل سپاہی سمجھتی ہو؟ میں شاہی فوج کا جرنیل رہ چکا ہوں۔ میں دشمن سے مقابلہ کروں گا اور اپنی عزت بچانے کے لیے جان بھی قربان کر دوں گا۔

چونکہ شیبا تاریخ کی سٹوڈنٹ تھی اس لیے سمجھ گئی کہ یقیناً سیزر قتل ہو چکا ہے۔ ملک روم پر آکٹیوس کا قبضہ ہو چکا تھا۔ انطنی بھاگ کر مصر میں قلوپطرہ کے محل میں آ چکا ہوگا اور اب آکٹیوس یعنی روم کے بادشاہ کی فوجیں مصر کو فتح کرنے کے لیے بڑھ رہی ہوں گی۔

وہ ملکہ مصر کے شاہی محل میں داخل ہو گئی۔

دوسری کنیزیں اس سے جدا ہو گئیں۔ ایک کنیز نے کہا۔

”شاریان! اب تم ملکہ کے پاس جاؤ گی۔ ہم اجازت کے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتیں۔ تم خوش قسمت ہو!“

اور کنیزیں ہنستی ہوئی دوسرے محل کی طرف چلی گئیں۔

شیبا ملکہ کے خاص محل میں داخل ہوئی تو ایک خواجہ سرا نے اس سے پانی کی صراحی لے لی اور کہا۔

”شاریان! تجھے ملکہ قلوپطرہ یاد کر رہی ہیں۔“

شیبا کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ تاریخ کی سب سے بڑی ملکہ کے پاس جا رہی تھی۔ خواجہ سرا اسے ساتھ لے کر ملکہ کی خواب گاہ کے دروازے تک آیا اور بولا۔

”اب تم اندر جاؤ۔ ملکہ تمہیں اکیلے میں ملنا چاہتی ہے۔“

شیبا نے خوشی سے اچھلتے ہوئے دل پر قابو پایا اور بھاری کمخواب کا پردہ ہٹا کر خواب گاہ میں داخل ہو گئی —— کیا دیکھتی ہے کہ ایک شاندار کمرہ ہے۔ سارا فرش اور ساری دیواریں

قیمتی قالینوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ درمیان میں سونے کے پائیوں والا ایک عظیم الشان پلنگ بچھا ہے جس پہ سونے کی تاروں کے کام والے نیلے ریشمی تکیوں کے سہارے ملکہ قلو پطرہ لیٹی ہے۔ چاندی کی تپائی پر سونے کے گلاس رکھے ہیں جن پہ ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ کمرے میں عود و عنبر یعنی خوشبوئیں سلگ رہی ہیں اور سارا کمرہ خوشبوؤں سے بھرا ہوا ہے۔

ملکہ قلو پطرہ کے بالوں میں بھی سونے کے تار اور سفید قیمتی موتی پروئے ہوئے ہیں۔ اس کا رنگ سانولا اور ناک لمبا تھا۔ کلائیوں میں سونے کے کڑے تھے۔ بازوؤں پر سونے کے سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں گہرا سیاہ کاجل تھا اور پپوٹوں پر نیلے کنول کے بیج کوٹ کر ان کا برادہ چھڑکا ہوا تھا۔

شارلیان نے پلنگ کے قریب جا کر جھک کر آداب کیا۔

قلو پطرہ کی دوسری جانب تپائی پر پھلوں کا طشت رکھا تھا۔ قلو پطرہ نے سرخ انگوروں کا ایک گچھا اٹھایا اور اس کے انگور توڑ توڑ کر کھاتے ہوئے بولی۔

"شارلیان! تمہاری ملکہ ان دنوں بڑی پریشان ہے۔ اس لیے اس سے زیادہ دیر الگ نہ رہا کرو۔"

شیبا نے ادب سے کہا۔

"ملکہ سلامت! کنیز دریا پہ کنول کے پھولوں والا پانی لینے گئی

کی طرح اب شیبا بھی اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور تھی ـــــــ"

قلو پطرہ اٹھ کر قالین پر ٹہلنے لگی۔ وہ بہت بے چین تھی۔ وہ شیبا کے قریب آ کر رک گئی۔

"شارلیان"

قلو پطرہ نے اپنا ہاتھ شیبا کے کندھے پر رکھ کر کہا۔

"کیا تم میرے آخری وقت میں میری مدد نہ کرو گی؟"

شارلیان نے جھک کر ادب سے کہا۔

"ملکہ سلامت! میری جان بھی حاضر ہے آپ کے لیے"

شیبا سمجھ گئی تھی کہ ملکہ اب اسے سانپ کے بارے میں کہے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ شیبا تاریخ کے واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے گزرتے بلکہ خود ان میں داخل ہو کر دیکھ رہی تھی۔ ملکہ قلو پطرہ نے کہا۔

"شارلیان! تم میری خاص کنیز ہی نہیں۔ میری رازدار سہیلی بھی ہو۔ اب میں تم سے ایک ایسا کام کرنے کے لیے کہوں گی جو میں صرف تمہیں ہی کہہ سکتی ہوں"

شیبا کو سب معلوم تھا کہ وہ کیا کہنے والی ہے۔ اس نے جھک کر کہا۔

"میں حاضر ہوں ملکہ سلامت!"

قلو پطرہ نے کہا۔

"ابھی دریائے نیل کے سفید برج میں شاہی ہیرے کے

پاس جاؤ اور اس کے پاس جو سب سے زیادہ زہریلا سانپ ہے اسے ٹوکری میں بند کر کے میرے پاس لے آؤ"

"جو حکم ملکہ سلامت!"

شیبا سر جھکا کر شاہی خواب گاہ سے نکل گئی۔

شاہی محل میں فانوس روشن ہو گئے تھے۔ شیبا قلعے کی ڈیوڑھی سے گزر کر دریا کے کنارے پہنچی۔ یہاں اسے دور ہی سے سفید برج نظر آیا۔ اس برج میں شاہی سپیرا رہتا تھا جس کی عمر سو سال کے قریب تھی۔ اس نے شیبا کو دیکھ کر کہا۔

"شہزادیان! کس لیے آئی ہو بیٹی؟"

شیبا نے کہا۔

"ملکہ سلامت نے سب سے زہریلا سانپ منگوایا ہے"

بوڑھا سپیرا خاموش ہو گیا۔ شاید اسے سب کچھ معلوم تھا اور ملکہ اس سے پہلے بات کر چکی تھی۔ وہ اٹھا اور ایک پٹاری میں کالے سیاہ رنگ کا ایک فٹ کا سانپ دم سے پکڑ کر نکالا اور اسے ایک چھوٹی سی پٹاری میں بند کر کے ٹوکری میں رکھا اور اوپر سبز پتے اور انجیریں رکھ دی اور کہا۔

"قلعے کی ڈیوڑھی میں پہرے دار پوچھے کہ یہ کیا ہے تو کہہ دینا ملکہ سلامت کے لیے دریا سے انجیریں توڑ کر لائی ہوں"

خبردار اگر تم نے پھر ایسی بات کی ——— ہاں۔ اگر تم چاہو تو یہاں سے فرار ہو سکتی ہو۔ میں نے تمہاری حفاظت کا سارا انتظام کروا لیا ہے۔ میرے خاص آدمی تمہیں اپنی حفاظت میں بابل کے شہر میں پہنچا دیں گے"

قلوپطرہ نے گردن اٹھا کر کہا۔

"اگر تم ایک بہادر جرنیل ہو تو میں بھی ایک بہادر ملکہ ہوں۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ تاریخ میں میرا نام ایک بزدل ملکہ کہی جائے۔ میں بھی تمہارے ساتھ اسی محل میں رہوں گی اور اپنی عزت بچانے کے اگر جان بھی دینی پڑے تو بڑے سکون سے مر جاؤں گی"

شیبا ایک طرف سر جھکائے کھڑی تاریخ کے ان دونوں کرداروں کی گفتگو سن رہی تھی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ ان دونوں کا انجام حسرت ناک موت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مگر اس کے ہونٹ بند تھے۔ وہ انہیں ان کے انجام کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ تاریخ کی ایک خاموش تماشائی تھی۔

○

سانپ، قلوپطرہ اور ابوالہول

انطنی ملکہ قلوپطرہ کی خواب گاہ سے چلا گیا۔
شیبا اسی طرح خاموش کھڑی تھی۔ قلوپطرہ سر جھکائے کچھ سوچتی رہی۔ اس کے چہرے پر سوائے مایوسی کی پرچھائیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سر اٹھا کر شیبا کی طرف دیکھا اور کہا۔

"شارلیان!"
قلوپطرہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
"ایسا لگتا ہے کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔"
شیبا نے کہا۔
"ایسا نہ کہیں ملکہ سلامت! آخری وقت آپ کے دشمنوں کا آئے۔"
حالانکہ شیبا خوب جانتی تھی کہ ملکہ قلوپطرہ کا سچ مچ آخری وقت آن پہنچا ہے مگر وہ یہ بات اسے نہ کہہ سکتی تھی۔ یہ تاریخ کا سانحہ تھا اور تاریخ کے اخلاقی ضابطے اور قانون کے مطابق عبرتناک تھا

"شارلیان! صندوق کھول کر ٹوکری نکال کر مجھے دے دو۔ اپنی عزت بچانے کا وقت آگیا ہے۔"
شیبا کا ایک بار دل چاہا کہ اسے خودکشی کرنے سے منع کر دے۔ مگر پھر یہ خیال آیا کہ وہ تاریخ کے واقعات میں دخل نہیں دے سکتی۔ اس نے ادب سے سر جھکایا اور صندوق میں سے ٹوکری نکال کر لے آئی۔ قلوپطرہ نے ٹوکری ہاتھ میں لے کر انجیروں کو پرے ہٹایا۔ اندر چھوٹی سی پٹاری رکھی تھی جس میں زہریلا سانپ بند تھا۔
قلوپطرہ پلنگ پہ لیٹ گئی۔ سانپ کی پٹاری اس نے سینے پر رکھ لی۔ پھر شیبا کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔
"الوداع میری پیاری سہیلی!"
شیبا کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دنیا کی ایک بہت بڑی ملکہ کو خودکشی کرتے دیکھ رہی تھی مگر اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتی تھی۔ قلوپطرہ نے پٹاری کھولی۔ اس میں ہاتھ ڈال کر سیاہ کالے سانپ کو باہر نکال لیا۔ سانپ نے پھنکارتے ہوئے اپنا چھوٹا سا پھن کھول لیا اور اپنی دو شاخہ سرخ زبان بار بار غصے کی حالت میں باہر نکالنے لگا۔
قلوپطرہ نے اس کا پھن اپنے بازو کے ساتھ لگا لیا۔ سانپ نے پلک جھپکنے میں ڈس دیا۔ شیبا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ ہونے والا ہے اور

شیبا نے تاریخ میں یہ بھی پڑھا تھا کہ ملکہ قلوپطرہ کو اس کی خاص کنیز نے انجیروں سے بھری ہوئی ٹوکری میں چھپا کر سانپ پیش کیا تھا۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ شیبا نے ٹوکری بوڑھے سپیرے سے پکڑ لی اور سلام کر کے واپس روانہ ہوئی۔

قلعے کی ڈیوڑھی میں رات کے وقت چیکنگ سخت ہو جاتی تھی، اور اس وقت تو دشمن کی فوجیں شہر کی دیوار سے چند کوس ہی دور رہ گئی تھیں۔ پہرے داروں نے شیبا کی ٹوکری کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ شیبا نے پتوں میں رکھی ہوئی انجیریں دکھا کر کہا۔

"ملکہ سلامت کے لیے دریا سے تازہ انجیریں توڑ کر لائی ہوں"

حالانکہ ان کے نیچے بہت ہی زہریلا سانپ پٹاری میں بند تھا، لیکن شیبا کے چہرے پر پریشانی کے آثار اس لیے نہیں تھے کہ اس نے تاریخ میں پڑھ لیا تھا کہ سانپ بڑی حفاظت اور رازداری سے قلوپطرہ تک پہنچ گیا تھا اور بعد میں شہنشاہ روم کے حکم سے ان پہریداروں کے سر کاٹ ڈالے گئے تھے کیونکہ ان کی غفلت کی وجہ سے قلوپطرہ خودکشی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی جو وہ نہیں چاہتے تھے۔

پہرے داروں نے شیبا کو اندر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ شیبا سانپ کی ٹوکری لے کر قلوپطرہ کی خواب گاہ میں آئی تو وہ بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے ٹوکری لے کر

ہو کر رہے گا۔ پھر بھی اتنی عظیم الشان ملکہ کو اپنے سامنے سانپ ڈسواتے دیکھ کر اس کی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔

سانپ کے زہر نے اپنا کام کر دیا تھا۔ قلوپطرہ کے ہونٹوں سے نیلا جھاگ بہنے لگا تھا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ شیبا شور مچاتی ہوئی بھاگی۔

"ملکہ سلامت نے خودکشی کر لی ہے"

کچھ پہرے دار بھاگ کر اندر آئے۔ انہوں نے فرش پر رینگتے ہوئے سانپ کو کچل ڈالا۔ ملکہ کے پاس جا کر دیکھا۔ ملکہ مر چکی تھی۔ کنیزیں دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔ رومن فوجیں محل میں قتلِ عام کر رہی تھیں۔

اب شیبا کو اپنی جان بچانے کی فکر پڑی۔ وہ ملکہ کی خواب گاہ سے نکل کر کنیزوں کے خاص کمرے کی طرف بھاگی۔ شیبا کی آنکھوں کے سامنے رومن سپاہیوں نے کئی مصری پہرے داروں کو قتل کر ڈالا۔ کنیزیں چیخ رہی تھیں۔ کئی کنیزوں کو رومن سپاہیوں نے دبوچ کر اغوا کر لیا۔ شیبا اور دو دوسری کنیزیں جان بچا کر خاص کمرے میں پہنچ گئیں جو تہہ خانے میں تھا۔ اب سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایک کنیز کا تو رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ ایک کنیز ذرا زیادہ عمر کی تھی اور سمجھدار تھی۔ اس نے کہا۔

پٹاری کھولی تو کالے سانپ نے پھنکار ماری۔ قلوپطرہ نے جلدی سے پٹاری بند کر دی اور شیبا سے کہا۔

”شاریان! اسے صندوق میں لے جا کر بند کر دو جب اس کی ضرورت پڑے گی تو مجھے لا کر دے دینا۔“

”جو حکم ملکہ سلامت!“ شیبا نے جھک کر کہا۔

اس نے سانپ کی پٹاری صندوق میں جا کر بند کر کے رکھ دی۔

اسی رات شہنشاہ روم کی فوجوں نے قلعہ پر حملہ کر دیا اور قلعہ کی دیواریں توڑ کر شاہی محل میں داخل ہو گئے۔ جرنیل آکٹو ملیس ملکہ قلوپطرہ کو زندہ گرفتار کر کے اسے ذلت کے ساتھ سارے شہر میں پھروانا چاہتا تھا۔ انطنی قلعے کی ڈیوڑھی میں لڑتا لڑتا قتل کر دیا گیا تھا۔ ملکہ قلوپطرہ اپنی خواب گاہ میں پریشان بیٹھی تھی۔

شیبا بھی اس کے قریب کھڑی تھی۔ وہ پریشان نہیں تھی۔ کیونکہ جو کچھ ہونا تھا اسے معلوم تھا۔ لیکن اوپر سے وہ اپنے آپ کو پریشان ظاہر کر رہی تھی۔ اتنے میں ایک سپاہی بھاگتا ہوا اندر آیا اور جھک کر بولا۔

”ملکہ سلامت دشمن کی فوجیں آپ کے محل کی طرف بڑھ رہی ہیں۔“

اتنا کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔ قلوپطرہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے شیبا سے کہا۔

”رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ شاہی محلوں میں دشمن کی فوجیں قتل عام کیا ہی کرتی ہیں اس لیے اب اپنی عزت اور جان بچا کر یہاں سے نکل چلو۔“

شیبا نے کہا۔

”ہم یہاں سے کیسے نکل سکتی ہیں؟“

بڑی کنیز بولی۔

”اس خاص کمرے میں ایک خفیہ راستہ قلعے کے باہر نکل جاتا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔“

وہ کمرے کی پچھلی کوٹھڑی میں گئی۔ شیبا اور دوسری کنیز بھی اس کے ساتھ تھی۔ کوٹھڑی میں جا کر بڑی کنیز نے ایک جگہ سے تختہ ہٹا دیا۔ اور اندر ایک سرنگ کا راستہ نکل آیا۔

”سرنگ میں داخل ہو جاؤ۔“

تینوں سرنگ میں داخل ہو گئیں۔ سرنگ میں اندھیرا تھا۔ وہ ایک دوسری کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھ رہی تھیں۔ سرنگ میں مکڑیوں نے جالے تان رکھے تھے۔ یہ جالے ان کے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔ اور وہ انہیں ہاتھ سے ہٹاتی چلی جا رہی تھیں۔

کتنی دیر تک وہ سرنگ میں چلتی چلی گئیں۔ آخر انہیں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔ بڑی کنیز نے کہا۔

”یہ دریا کی ہوا ہے۔ ہم قلعہ سے باہر نکل آئی ہیں۔“

اور پھر وہ سرنگ سے باہر آ گئیں۔

وہ قلعے سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر نکلی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ قلعے میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی اور شور و غل کی آوازیں آ رہی تھیں۔

بڑی کنیز کہنے لگی۔

"ہم شاہی پُل پر سے دریا پار نہیں کریں گی کیونکہ وہاں دشمن کے سپاہیوں کا پہرہ ہو گا۔ ہمیں اسی جگہ سے دریا میں اتر کر تیرتے ہوئے دریا پار کرنا ہو گا۔"

شیبا اور دوسری کنیز نے کہا۔

"مگر ہمیں تو تیرنا نہیں آتا۔"

بڑی کنیز بولی۔

"تیرنا تو مجھے بھی نہیں آتا۔ لیکن ہمیں اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے تیرنے کی کوشش کرنی ہو گی۔ اگر اسی جگہ بیٹھی رہیں تو دشمن کے سپاہی ہمیں اغوا کر کے لے جائیں گے۔"

رات اندھیری تھی۔ آسمان نیلے ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ دریا کا پاٹ اگرچہ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ مگر اس کی لہریں اندھیرے میں بڑی خوفناک دکھائی دے رہی تھیں۔ بڑی کنیز نے کہا۔

"یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ دشمن کے سپاہی یہاں کوئی دم میں پہنچ جائیں گے۔ چلو میرے پیچھے دریا میں

چھلانگ لگا دو اور ہاتھ پاؤں مار کر دوسرے کنارے پر پہنچنے کی کوشش کرو۔"

بڑی کنیز نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد دوسری کنیز اور پھر شیبا نے بھی چھلانگ لگا دی۔

دریا کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ شیبا عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ لاہور میں وہ کبھی چھوٹی نہر میں بھی نہیں نہائی تھی اور اب یہاں اسے ایک دم سے اتنے بڑے دریا میں چھلانگ لگانی پڑ گئی تھی۔ پھر بھی اس نے حوصلہ نہ ہارا۔ پہلے تو وہ دریا کے نیچے ہی نیچے چلی گئی۔ پھر اس نے زور زور سے ہاتھ پاؤں ہلائے تو اوپر دریا کی سطح پر آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ دوسری کنیزیں بھی اوپر آ چکی تھیں۔

شیبا نے اندازے سے بازو ہلاتے ہوئے دوسرے کنارے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اندھیرے میں اسے دوسری کنیزوں کے سر ہی دکھائی دے رہے تھے۔ شیبا کو ایک دو بار غوطہ بھی آ گیا۔ مگر اس نے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اپنے سر کو پانی سے باہر ہی رکھنے کی کوشش کی۔

پھر اسے ایک کنیز کی چیخ کی آواز سنائی دی۔

"مگر میں ــــ"

اس کے منہ سے نکلا اور پھر اس کا سر پانی کے اندر غائب

ہو گیا۔ دریائے نیل کا خونی مگرمچھ اسے ٹانگوں سے پکڑ کر نیچے کھینچ کر لے گیا تھا۔ شیبا نے بڑی کنیز کو آواز دی۔ مگر اس نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ شیبا کو اب اپنی پڑی ہوئی تھی۔ وہ کسی دوسرے کی کیا خبر لے سکتی تھی۔ وہ خود ڈوبنے والی تھی۔ اتنا وہ سمجھ گئی تھی کہ دریا میں کوئی خونی مگرمچھ رہتا ہے جس نے پہلے ایک کنیز کو پکڑا اور پھر دوسری کنیز کو گھسیٹ کر پانی کے اندر نیچے لے گیا ہے۔

شیبا نے شکار کی کہانیوں میں پڑھ رکھا تھا کہ مگرمچھ اپنے شکار کو ٹانگوں سے دبوچ کر پانی کے اندر ہی اندر لے جاتا ہے اور وہاں اسے پانی کے اندر غار میں جا کر رکھ دیتا ہے تاکہ جب لاش گل سڑ جائے تو وہ اسے چٹ کرے۔

شیبا ڈر رہی تھی کہ دونوں کنیزوں کے بعد کہیں اس کی بھی باری نہ آجائے۔ موت سامنے کھڑی ہو تو انسان کے اندر ایک بار تو بہت طاقت آجاتی۔ یہی حال شیبا کا ہو رہا تھا۔ موت اس کے سر پہ منڈلانے لگی تھی۔ اس کے اندر اپنی جان بچانے کے لیے بے پناہ قوت آگئی اور اس نے اتنی طاقت کے ساتھ جلدی جلدی ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے کہ دریا کی لہروں نے اسے تیزی کے ساتھ اٹھا کر دریا کے دوسرے کنارے پہ پہنچا دیا۔

شیبا لمبی لمبی گھاس کو پکڑ کر کنارے پہ آگئی۔ اس کے سارے

کپڑے بھیگ گئے تھے۔ وہ تھک کر چور ہو رہی تھی۔ لیکن جان بچ جانے کی اسے خوشی بھی بہت تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور کنارے سے اٹھ کر دور جا کر کھجور کے ایک درخت تلے بیٹھ گئی۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں مگرمچھ دریا کے کنارے پر سے اسے گھسیٹ نہ لے۔

شیبا نے اب جو اپنی حالت پہ غور کیا تو اسے رونا آگیا۔ عنبر ناگ ماریا کی داستان میں ان لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ مگر ان میں تو بڑی طاقتیں تھیں۔ مثلاً عنبر مر نہیں سکتا تھا۔ ماریا غائب تھی اور زمین سے دو چار فٹ بلند ہو کر ہوا میں اڑ بھی سکتی تھی اور ناگ اپنی جون بدل کر جس جانور کی چاہے شکل اختیار کر سکتا تھا۔ اور خلائی لڑکی کیٹی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ بھی زبردست طاقت اپنے اندر رکھتی تھی اور سوائے زہریلی گیس اور آگ کے اور کسی طرح سے نہیں مر سکتی تھی۔ لیکن شیبا بے چاری تو ایک عام کمزور لڑکی تھی۔

اب اسے احساس ہونے لگا کہ اس نے تین ہزار سال پرانے زمانے میں آ کر کس قدر حماقت کی ہے۔ خدا جانے اب وہ واپس بھی جا سکے گی یا نہیں ———— اس کا حال تو علی بابا چالیس چور کی کہانی کے کردار قاسم کی طرح تھا جو ڈاکوؤں کے غار کے اندر تو آگیا مگر اب کھل جا سم سم کہنا بھول گیا تھا اور غار کے اندر

بلند ہو چکا تھا۔

تین ہزار سال پہلے کی آدھی رات —— خاموشی —— ایسی خوفناک خاموشی کہ ثیبا نے لاہور میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کہاں سکوٹروں، موٹر کاروں، رکشوں اور ٹرکوں کا شور اور کہاں ایسی خاموشی جیسے وہ زمین کے اندر ہزاروں فٹ نیچے آ گئی ہو۔ اتنا سکوت تھا۔ اتنی خاموشی تھی کہ ثیبا کو دریا کی پُرسکون لہروں کے بہنے کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اس کے کپڑے کچھ کچھ سوکھ گئے تھے۔ وہ ٹیلے اور محل کی طرف سے شعلے اُٹھتے صاف نظر آ رہے تھے۔

ثیبا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے؟ کیا کر سکتی ہے؟ اور اس کے ساتھ آگے چل کر کس قسم کے واقعات پیش آئیں گے۔ سب سے پہلا خیال جو اس کے ذہن میں آیا یہی تھا کہ ابھی رات کا اندھیرا ہے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اس شہر سے جس قدر دُور ہو سکتی ہے دور ہو جائے۔ اسے نہ تو پرانے مصر کے شہروں کا علم تھا اور نہ ہی یہ پتہ تھا کہ جس طرف کو وہ جائے گی آگے کون سا شہر آ جائے گا۔

وہ یہ سوچ کر کھجور کے درخت کے نیچے سے اٹھی اور ایک طرف روانہ ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں وہ ایک ایسے صحرا میں سے گزر رہی تھی جہاں کہیں کہیں کھجوروں کے جھنڈ اور انگور و انجیر کے باغ بھی تھے کیونکہ یہ علاقہ شہر کے قریب دریا کے کنارے کا علاقہ تھا اس لیے

زرخیز تھا۔ چلتے چلتے وہ ان باغوں اور کھجوروں کے جھنڈوں سے بھی دور نکل گئی۔ لاہور میں وہ کبھی اتنا پیدل نہیں چلی تھی۔ گھر سے وہ کالج بس میں جاتی تھی۔ لائبریری میں بھی بس میں بیٹھ کر یا اپنے والد کی کار میں سوار ہو کر آ جاتی تھی۔

چنانچہ وہ بہت جلد تھک گئی۔ وہ ایک ریتلے میدان میں چل رہی تھی۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اسے ریتلے میدان میں تھوڑی دور ایک چھوٹا سا ٹیلہ دکھائی دیا۔ وہ اس ٹیلے کی طرف بڑھی کہ وہاں جا کر کچھ دیر آرام کرے گی۔

ٹیلے کے پاس پہنچ کر ثیبا نے دیکھا کہ ٹیلہ چھوٹا سا تھا اس کے اوپر ابوالہول کا ایک بُت بنا ہوا تھا۔ ثیبا نے اس بُت کو فوراً پہچان لیا۔ یہ بت تین ہزار سال بعد ۱۹۸۳ء کے زمانے میں بھی مصر میں موجود تھا مگر جس زمانے سے ثیبا آئی تھی اس زمانے میں ابوالہول کے اس بت کی حالت بہت خستہ تھی اور ٹوٹا پھوٹا ہوا تھا۔ مگر اس وقت جبکہ ثیبا اس بت سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی یہ بت بڑی صحیح حالت میں تھا اور ستاروں کی روشنی میں بھی اس کے نقش و نگار اور اس کے چہرے پر ملا ہوا نیلا روغن چمک رہا تھا۔ اس بت کا نچلا دھڑ شیر کا تھا اور سر فرعون مصر کا تھا۔

ٹیلے پر چوڑی سیڑھیاں اس بُت تک چلی گئی تھیں۔ ثیبا نے سوچا کہ اوپر بُت کے پاس جا کر تھوڑی دیر سو کر آرام کرے ——

وہ سیڑھیاں چڑھ کر بت کے پاس آ گئی ـــــ گہری خاموشی اور رات کے اندھیرے میں یہ بت بہت ہی ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ شیبا نے اب غور سے دیکھا کہ یہ بہت بڑا بت تھا۔ شیر کا دھڑ بھی نیلے رنگ کا تھا اور اس کے پچھلے پنجوں کے درمیان میں چھوٹی چھوٹی گلیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ اندھیرے میں شیبا نے دیکھا کہ ان گلیوں میں ایک جگہ پتھر کا چھوٹا سا چبوترا بنا ہوا تھا۔

شیبا کو نیند آ رہی تھی۔

وہ آرام کرنے کے خیال سے اس پتھر کے چھوٹے سے چبوترے پر لیٹ گئی۔ لیٹنے کے بعد اس کا سر لوہے کی ایک چھوٹی سی کیل سے لگا۔ اس نے کیل کو باہر اکھاڑنے کی کوشش کی تو کیل اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی چبوترا ایک طرف کو جھک گیا اور شیبا لڑھک کر ایک اندھیری کوٹھڑی میں گر پڑی۔

وہ جلدی سے اٹھی اور اس نے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا کہ وہ ایک چھوٹی سی قبر نما کوٹھڑی میں آ گئی تھی اور چبوترا کھسک کر واپس اپنی جگہ پر چلا گیا تھا۔ شیبا نے سر پیٹ لیا کہ وہ خوامخواہ اس چبوترے پر لیٹی۔ یہ اندھیری کوٹھڑی اس قدر چھوٹی تھی کہ اٹھنے سے اس کا سر چھت سے جا لگتا تھا اور لیٹتی تھی تو اس کے پاؤں دیواروں سے ٹکراتے تھے۔

اس نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح پتھر کی سِل کو ہٹا کر باہر نکل جائے مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ پتھر کی سِل چھت کے ساتھ برابر ہو گئی تھی اور سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ذرا سی بھی ہل جائے۔

لاہور کالج کی تاریخ کی سٹوڈنٹ عنبر ناگ ماریہ پانچ ہزار سالہ واپسی کے سفر کے ایڈونچر میں خود پھنس گئی تھی اور اس کا اپنا خطرناک ایڈونچر شروع ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ حوصلہ ہار دینے سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوگا کہ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گی اور اس کے کسی رشتہ دار عزیز کو قیامت تک معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس کی لاش مصر کے صحرا میں ابوالہول کے کھنڈر کے نیچے پتھر بن کر پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے یہاں سے فرار ہونے کے لیے عقل سے کام لینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

شیبا نے دیواروں اور فرش کو ٹٹول ٹٹول کر دو تین بار دیکھا۔ دیواریں اور چھت سخت پتھر کے بنے ہوئے تھے اور وہاں کوئی ہلکی سی درز بھی نہیں تھی ـــــ وہ تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو یاد کر کے آنسو آ گئے۔ کچھ دیر وہ آہستہ آہستہ سسکیاں لیتے ہوئے روتی رہی۔ اس اندھیری قبر میں اس کے آنسو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا پھر اس نے سجدے میں گر کر خدا سے گڑگڑا کر اپنی نجات کے لیے دعا مانگی اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

خدا جانے وہ کتنی دیر سوتی رہی ہوگی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اندھیری قبر نما پتھریلی کوٹھڑی میں دن کی روشنی آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ باہر کتنا دن چڑھ آیا ہے۔ شیبا نے سوچا کہ اگر یہ کوٹھڑی چاروں طرف سے بند ہے تو اسے آکسیجن کہاں سے آ رہی ہے؟

اگر اسے تازہ ہوا یعنی آکسیجن نہ آ رہی ہوتی تو اب تک تو وہ دم گھٹ جانے سے مر گئی ہوتی۔ اندر کوٹھڑی کی ساری فضا کاربن ڈائی آکسائیڈ سے بھر چکی ہوتی جو کہ اس کے سانس کے ساتھ اس کے جسم سے باہر نکل رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ وہ سوراخ کہاں ہے جہاں سے تازہ ہوا آ رہی ہے اور گندی ہوا باہر جا رہی ہے۔

شیبا نے ایک بار پھر بڑی احتیاط کے ساتھ دیواروں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ ہاتھ پھیرتے پھیرتے ایک جگہ اس کا ہاتھ دیوار میں سے تھوڑی سی ابھری ہوئی کسی نلکی سے ٹکرایا۔ شیبا نے اس نلکی کے آگے منہ رکھا تو اسے محسوس ہوا کہ نلکی میں سے ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ شیبا نے نلکی کو پکڑ کر اندر کی طرف کھینچا۔ مگر نلکی اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلی۔ اس میں سے تازہ اور ٹھنڈی ہوا برابر آ رہی تھی۔

اسے بھوک اور پیاس نے ستانا شروع کیا۔ شیبا نے سوچا کہ وہ دم گھٹنے سے تو نہیں مری لیکن پیاس کی وجہ سے بہت جلد مر جائے گی۔ ابھی اسے اتنی پیاس نہیں لگی تھی کہ اس کا حلق خشک

ہو اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم جائیں مگر تھوڑی دیر بعد اس کی یہ حالت ہونے والی تھی۔

شیبا نے نلکی کو ہلانے کا کام نہ چھوڑا۔ اسے محسوس ہوا کہ زیادہ ہلانے جلانے سے نلکی اپنی جگہ سے ہل گئی ہے۔ کافی دیر بعد جب شیبا کا حلق پیاس سے خشک ہونا شروع ہو گیا تھا نلکی اپنی جگہ سے اکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے نلکی پرے رکھ دی اور سوراخ میں انگلی ڈال کر اسے چوڑا کرنے لگی۔ ریت اور بجری نیچے گرنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا زیادہ آنے لگی تھی۔

شیبا نے سوراخ کے ساتھ آنکھ لگا کر دیکھنے کی کوشش کی مگر دوسری جانب بھی اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ لیکن ہوا خوب تازہ تھی۔ بہت زیادہ محنت کرنے کے بعد شیبا ایک پتھر کی سل کو اکھاڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے بعد تھوڑی سی محنت کے بعد دوسری اور پھر تیسری سل بھی اکھڑ گئی اور پھر وہاں اتنا سوراخ بن گیا کہ شیبا اس میں سے گزر کر دوسری طرف چلی گئی۔

یہ سوراخ زمین سے چار فٹ کی بلندی پر ایک دیوار میں تھا۔ شیبا ایک کھلی کوٹھڑی میں آ گئی تھی جس کی ایک جانب سرنگ سی آگے جا رہی تھی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد شیبا نے پانی کے گرنے کی آواز سنی۔ اب اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی

سادی ہو گئی تھیں ۔

اس نے کچھ دُور آگے جا کر دیکھا کہ سُرنگ میں ایک طرف سے پانی نکل کر زمین پر بنی ہوئی گول باؤلی میں گر رہا تھا۔ شیبا کا پیاس کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس نے جاتے ہی باؤلی کا ٹھنڈا پانی پینا شروع کر دیا۔ خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ اس کی جان میں جان آئی۔ وہ تازہ دم ہو گئی اور باؤلی کے پاس زمین پر بیٹھ کر غور کرنے لگی کہ سُرنگ کے اندر یہ جو پانی آتا ہے یہ کہاں سے آ رہا ہے پانی زمین کے اندر ہی اندر جذب ہو کر خدا جانے کہاں چلا جاتا تھا۔ یہ قدیم مصر کے راز تھے جو آج تک کسی کو معلوم نہ ہو سکے تھے۔

باؤلی سے آگے سرنگ پھر آگے نکل گئی تھی۔

شیبا نے سوچا کہ یہاں سے کسی طرح نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے چنانچہ اسی خیال کے ساتھ وہ اُٹھی اور سرنگ میں چلنے لگی۔ سرنگ میں اندھیرا تھا اور تازہ ہوا اسی طرح آ رہی تھی۔ پانی پی کر شیبا کے اندر ایک نئی طاقت آ گئی تھی۔ اگرچہ اسے بھوک بھی لگی تھی مگر پانی پی لینے سے اسے کافی حوصلہ ہو گیا تھا اور بھوک کا احساس تھوڑی دیر کے لیے مٹ گیا تھا۔

سُرنگ کا فرش ٹھنڈی ریت کا تھا اور ڈھلانی ہونے لگا تھا۔ شیبا کو محسوس ہوا کہ وہ زمین کے نیچے کی طرف جا رہی ہے۔ جیسے کوئی اترائی اُتر رہا ہو۔ آگے جا کر زمین پھر ہموار ہو گئی۔

اب شیبا نے ایک روشنی سی دیکھی جو سرنگ کی چھت پر ایک جگہ پڑ رہی تھی۔ یہ روشنی ایک کھڑکی میں سے نکل رہی تھی جو روشن دان کی طرح دیوار میں اوپر جا کر بنا ہوا تھا۔ قریب پہنچی تو وہاں پتھر کی سیڑھی بنی ہوئی تھی جو روشن دان تک چلی گئی تھی۔ روشنی اسی میں سے نکل رہی تھی۔ یہ روشنی شیبا کے لاہور والے گھر کے بلب یا ٹیوب لائٹ کی طرح کی نہیں تھی۔ بلکہ یہ ایک ہلکی نیلی اور سبز روشنی تھی جو کسی وقت تبدیل ہو کر زرد ہو جاتی تھی اور پھر ہلکا نیلا رنگ اختیار کر لیتی تھی۔

شیبا سیڑھیاں چڑھ کر روشن دان تک گئی۔

اس نے آہستہ سے سر اٹھا کر دوسری طرف جھانکا تو کیا دیکھتی ہے کہ اُدھر ایک چھوٹے سے تخت پہ کالی بلی کا ایک بت رکھا ہے جس کے آگے تھال میں پھل اور خشک میوے پڑے تھے۔ ایک کٹورا بھی پاس ہی پڑا تھا جو اوپر سے ڈھکا ہوا تھا۔ روشن دان میں سے فرش زیادہ دور نہیں تھا پھل اور خشک میوے دیکھ کر شیبا کی بھوک چمک اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ کوٹھڑی میں اور کوئی نہیں تھا اور کالی بلی کے سر پہ ایک دیا جل رہا تھا۔ جس کی لَو کبھی ہلکی نیلی کبھی سبز اور کبھی زرد ہو جاتی تھی۔

شیبا اس کوٹھڑی میں کُود گئی۔

تاریخ کی کتابوں میں اور پھر عنبر ناگ ماریا کی واپسی کی قسطوں میں اس نے پڑھا تھا کہ مصر کے بعض بادشاہ کالی بلی کی پوجا کیا کرتے

تھے اور ان کے بُت بنا کر بُت خانوں میں رکھا کرتے تھے۔

پھل باسی ہو گئے تھے اور خشک میوے ویسے کے ویسے ہی تھے۔ شیبا کو بڑی بھوک لگی تھی۔ اس نے خشک میوے کھانے شروع کر دیئے۔ کٹورے میں دریا کا پانی رکھا ہوا تھا۔ اس نے سارے میوے کھا کر پانی پیا تو وہ پھر سے تازہ دم ہو گئی۔ خدا جانے کون کہاں سے آکر بلی کے بُت کے آگے یہ چیزیں رکھ گیا تھا۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ بُت آدھی رات کو کھانے پینے کی چیزوں میں سے ان کی طاقت اور رس نکال کر کھا جاتے ہیں۔ اس لیے وہ لوگ اپنے بُتوں کے آگے کھانے پینے کی چیزیں رکھا کرتے تھے۔ شیبا نے دیکھا کہ بُت کے پیچھے دیوار کے ساتھ ایک تابوت پڑا تھا جس پر ایک ممی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس نے قریب جا کر تابوت کو اٹھایا تو اس کے اندر کسی ممی کا سونے کا بُت پڑا تھا۔

شیبا اسے غور سے تک رہی تھی کہ اسے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ آوازیں دیوار کے پیچھے سے آ رہی تھیں اور قریب آتی جا رہی تھیں یہ لوگ اندر آ رہے تھے۔ شیبا کو اور کچھ نہ سوجھا۔ وہ تابوت کے اندر داخل ہو کر سونے کے بت کے ساتھ لیٹ گئی اور تابوت کا ڈھکنا اوپر سے بند کر لیا۔

اور تابوت ہوا میں اُڑنے لگا

تابوت میں سرہانے کی طرف دو سوراخ تھے۔ سوراخ بہت چھوٹے تھے مگر شیبا ان میں سے باہر کا منظر دیکھ سکتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ سامنے والی دیوار ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ الگ ہو گئی اور اس میں سے تین آدمی نکل کر اندر آ گئے۔ دو آدمیوں نے نیلے رنگ کے موٹے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ بڑے ہٹے کٹے آدمی تھے۔ سروں پر بال ہی بال تھے۔ کمر کے ساتھ لمبے خنجر لٹکے ہوئے تھے۔ تیسرا آدمی بھاری بھر کم تھا مگر اس کا سر منڈا ہوا تھا اور اس نے مصر کے پجاریوں یعنی راہبوں کا زرد لباس پہن رکھا تھا۔

دونوں آدمی شکل و صورت سے ڈاکو لگ رہے تھے۔ وہ اندر آتے ہی بے تابی سے تابوت کی طرف بڑھے۔ لیکن پجاری اچانک ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ایک ڈاکو نے کہا۔

”ہم تسلی کرنا چاہتے ہیں کہ تابوت کے اندر سونے کی مورتی ہے کہ نہیں —— ہم نے تمہیں بھاری رشوت

دی ہے"

پجاری نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"یہ ایک مقدس مورتی ہے۔ یاد رکھو۔ اگر تم نے چھبیس گھنٹوں سے پہلے تابوت کھول کر مورتی کو دیکھا تو تم دونوں اندھے ہو جاؤ گے اور مقدس مورتی تم سے انتقام لے گی"

دوسرا ڈاکو بولا۔

"تم ہمیں بتا دو کہ اس کے اندر مورتی موجود ہے"

پجاری نے کہا۔

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مورتی سونے کی ہے اور اس تابوت کے اندر رکھی گئی ہے۔ اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے — کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ اسے چھبیس گھنٹوں سے پہلے نہیں کھولو گے؟ کیونکہ اگر تم نے اسے کھول دیا تو اس کا اثر مجھ پر بھی پڑے گا اور ہو سکتا ہے تمہارے اندھے ہونے کے ساتھ ساتھ مورتی زندہ ہو جائے اور تمہیں ہلاک کر ڈالے"

ڈاکو اگرچہ بڑے ظالم اور قاتل قسم کے انسان تھے اور ان کے دلوں میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن پرانے زمانے کے لوگوں کی طرح وہ بھی بڑے وہم پرست تھے۔ انہوں نے

یک زبان ہو کر پجاری کی یعنی کاہن کو یقین دلایا کہ وہ چھبیس گھنٹے سے پہلے تابوت کا ڈھکنا ہرگز ہرگز نہیں کھولیں گے۔ پجاری کاہن نے کہا۔

"کونے میں سے رسی اٹھاؤ اور تابوت کے گرد لپیٹ کر کس کر باندھ دو تاکہ اس کا ڈھکنا غلطی سے بھی نہ کھل جائے"

شیبا تابوت کے اندر سونے کی مورتی کے اوپر لیٹی سوراخ میں سے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ ڈاکوؤں نے کونے میں سے رسی اٹھائی اور اسے تابوت کے گرد لپیٹ کر کس کر باندھ دیا۔ ایک ڈاکو نے رسی باندھنے کے لیے تابوت کو ذرا سا اوپر اٹھایا تو بولا۔

"تابوت بڑا بھاری ہے شلانگو سردار۔ معلوم ہوتا ہے اس کے اندر دو مورتیاں ہیں"

شلانگو ڈاکو جو اپنے ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار تھا بولا۔

"حرامی — کیا خبر اندر دو ہی مورتیاں ہوں اور اس خبیث پجاری کو پتہ ہی نہ ہو"

اور وہ دونوں کھی کھی کر کے ہنس دیئے۔ پجاری نے کہا۔

"جلدی کرو۔ یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ میں تمہیں دیوتا اشرافی کا سونے کا بت دے رہا ہوں"

شلانگو ڈاکو نے دانت پیس کر کہا۔

”یہ مت بھولو کہ ہم نے بھی تمہیں کافی رشوت دی ہے اب اس پہ ہمارا حق ہے۔“

پجاری بولا میں حق ناحق کی بات نہیں کر رہا۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ دیر نہ کرو۔ اگر دن نکل آیا تو یہ بت جس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے سارے میوے خشک چٹ کر لیے ہیں زندہ ہو کر ہم تینوں کو بھی ہڑپ کر جائے گا۔“

اس خیال سے دونوں ڈاکو ڈر گئے۔ کیونکہ وہ وہم پرست تھے اور جو لوگ وہم کرتے ہیں وہ بزدل ہوتے ہیں۔

انہوں نے جلدی سے تابوت کو کاندھوں پہ اٹھایا اور دروازے میں سے باہر نکل گئے۔ پجاری بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ شیبا کو اب سوراخوں میں سے اندھیری دیواریں دکھائی دے رہی تھی — ڈاکو تابوت اٹھائے کسی اندھیری سرنگ میں سے گزر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد شیبا کو تازہ ہوا لگی۔ اس نے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اسے ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے دور تک پھیلے نظر آئے۔ تابوت کو ایک اونٹ پہ رکھ دیا گیا۔ ڈاکو شلانگو اور اس کے ساتھی نے پجاری کو الوداع کہا۔ پجاری گھوڑے پہ سوار ہو کر دوسری طرف روانہ ہو گیا اور دونوں ڈاکو اونٹ کے ساتھ ساتھ گھوڑوں پر سوار دوسری طرف روانہ ہو گئے۔

○

ڈاکوؤں کا سفر ساری رات جاری رہا۔

صبح ہوئی تو تابوت کے سوراخ میں سے دن کی روشنی اندر آنے لگی۔ اسی طرح آدھا دن گزر گیا۔ شیبا کو پیاس لگ رہی تھی۔ مگر وہ کسی کو آواز نہیں دے سکتی تھی۔ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اسے لاہور میں اپنا شادمان کالونی والا بنگلہ یاد آ رہا تھا جہاں وہ صبح اٹھ کر انڈے اور دودھ کا ناشتہ کرتی تھی۔ کہاں شادمان کی کوٹھی کا آرام اور کہاں یہ تابوت ——!

دوپہر کے بعد شلانگو سردار اور اس کا ساتھی ڈاکو ایک بہت بڑی چٹان کے غار میں داخل ہو گئے۔ اونٹ سے سونے کی مقدس مورتی کا تابوت اتار کر انھوں نے غار میں ایک طرف رکھ دیا اور تابوت کے اوپر سے رسی اتاری تاکہ غار کے منہ پر رکھنے کے لیے جھاڑیاں لا سکیں۔ پھر خود تھیلے میں سے خشک باجرے کی روٹی نکال کر پیاز کے ساتھ کھانے لگے۔ پانی کا مشکیزہ ان کے پاس ہی تھا۔ شلانگو نے کہا۔

”ہم کل صبح کے وقت تابوت کو کھول سکیں گے۔ خبردار اس سے پہلے تابوت کھولنے کی کوشش نہ کرنا۔ نہیں تو اندھے ہو جاؤ گے۔ اور مورتی زندہ ہو کر ہم دونوں کو قتل کر دے گی۔“

ڈاکو کہنے لگا۔

"سردار کیا میں پاگل ہو گیا ہوں جو چوبیس گھنٹے سے پہلے تابوت کو کھولوں گا تم بے فکر رہو۔ ہم اسے کل صبح کھولیں گے۔"

شلانگو سردار بولا۔

"جلدی سے روٹی ختم کرو۔ ابھی ہمیں کارواں سرائے میں جاکر پتہ کرنا ہے کہ ملک روم کو قافلہ کس دن روانہ ہو گا کیونکہ روم میں اس مورتی کی کافی قیمت پڑے گی۔"

دونوں جلدی جلدی کھانا کھا کر اُٹھے۔ بچی ہوئی روٹی کا تھیلا انھوں نے پانی کے مشکیزے کے ساتھ کونے میں ایک طرف رکھ دیا غار کے منہ پر سوکھی جھاڑیاں لاکر ڈال دیں کہ کسی کو نظر نہ آئے۔ اونٹ کو ٹیلے کے پیچھے لے جاکر ایک جگہ باندھا اور گھوڑوں پر بیٹھ کر کارواں سرائے کی طرف چلے۔

ان کے جاتے ہی شیبا تابوت میں سے باہر نکل آئی۔

پہلا کام اس نے یہ کیا کہ تھیلے میں سے بچی ہوئی باجرے کی روٹی نکال کر پیاز کے ساتھ کھائی اور مشکیزے کا ٹھنڈا پانی پیا۔ ایسا کھانا اس نے زندگی میں کبھی نہیں کھایا تھا۔ لیکن جو مزہ اسے اس روز آیا کبھی روغنی نان اور بھنے ہوئے مرغ کھانے سے نہیں آیا تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور غار کے منہ پر آکر جھاڑیوں میں

سے باہر جھانکا۔ دُور دُور تک صحرا پھیلا ہوا تھا۔ وہ اکیلی نکل بھی آتی تو صحرا میں راستہ بھول کر ہلاک ہو سکتی تھی۔ صحرا بڑا بے رحم ہوتا ہے۔ ایک بار کوئی انجان آدمی راستے سے بھٹک جائے تو پھر خدا ہی اسے موت کے منہ سے بچا سکتا ہے۔

اس لیے شیبا نے فیصلہ کیا کہ ان ڈاکوؤں کے ساتھ ہی رہے جب تک کہ یہ لوگ کسی بڑے شہر میں نہیں پہنچ جاتے —— شیبا کو اپنے ماں باپ اور بہن بھائی اور عنبر بہت یاد آرہے تھے اسے یقین تھا کہ اگرچہ اسے لاہور سے اس تین ہزار سالہ پرانے زمانے میں آئے تین چار دن گزر گئے ہیں لیکن لاہور میں اسے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے اور عنبر ابھی تک اسی طرح چھت پر سو رہا ہو گا۔ اور کسی کو اس کے گھر سے چلے جانے کی خبر نہیں ہوئی ہو گی۔

اور اس کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ لاہور میں شیبا کو گئے صرف آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا۔ اور عنبر اور شیبا کے گھر والے اپنے اپنے بستروں پر آرام سے پڑے سو رہے تھے۔

شیبا کچھ دیر غار میں ٹہلتی رہی۔ پھر اس نے تابوت میں لیٹی ہوئی مقدس مورتی کو دیکھا۔ یہ زیادہ بڑی مورتی نہیں تھی اور خالص سونے کی تھی۔ شیبا نے سوچا کہ یہ مورتی ڈاکوؤں کے ہاتھ نہیں آنی چاہیے اس نے مورتی کو تابوت میں سے باہر

نکالا اور غار میں دیوار کے آگے پڑے ہوئے پتھروں کے درمیان گڑھا کھود کر اس میں دفن کر کے اوپر پتھر رکھ دیئے۔ چھ سات پتھر اس نے تابوت میں بھی رکھ دیئے۔ تا کہ ڈاکوؤں کو تابوت اٹھاتے ہوئے بوجھ کم محسوس نہ ہو۔

اسے باہر گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز آئی۔

شیبا جلدی سے تابوت کے اندر لیٹ گئی اور ڈھکنا بند کر لیا۔ جھاڑیاں ہٹا کر دونوں ڈاکو غار میں داخل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ غار میں کسی کے پاؤں کے نشان تھے اور کوئی تھیلے میں سے روٹی کھا گیا تھا۔ شلانگو نے کہا۔

”کوئی یہاں آیا تھا“

دوسرا ڈاکو بولا۔

”سردار! ضرور کسی نے ہماری سونے کی مورتی چوری کر لی ہے۔ تابوت کھول کر دیکھو“

”نہیں“ شلانگو بولا۔

”چوبیس گھنٹے سے پہلے ہم تابوت نہیں کھولیں گے۔ ہم اندھے ہو جائیں گے۔ اور مقدس دیوی اشراقی ہم سے انتقام لے گی“

ڈاکو نے کہا۔

”سردار! مجھے یقین ہے کہ چور ہماری مورتی چرا کر لے گئے ہیں“

شلانگو نے چیخ کر کہا۔

”خاموش رہو ــــ میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ چوبیس گھنٹوں سے پہلے تابوت نہیں کھولا جائے گا“

شیبا تابوت کے اندر بیٹھی یہ ساری گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے پجاری کی یہ بات بھی سن رکھی تھی کہ اگر وقت سے پہلے تابوت کھولا گیا تو دیوی اشراقی ناراض ہو کر ان دونوں کو ہلاک کر دے گی۔

دونوں ڈاکو اٹھ کر غار سے باہر چلے گئے۔

شام ہو گئی ڈاکو غار میں نہ آئے۔ شیبا تابوت کھول کر اس میں بیٹھی رہی۔ اس نے تھوڑی سی روٹی کھالی اور پانی پی لیا۔ تا کہ بعد میں اسے بھوک اور پیاس تنگ نہ کرے ــــ جب رات ہو گئی تو شلانگو اور اس کا ساتھی ڈاکو باہر سو گئے۔

شیبا بھی تابوت میں لیٹ گئی۔ یہ لوگ صبح وہاں سے ملک روم کی طرف روانہ ہونے والے تھے۔ آدھی رات کو شلانگو ڈاکو کے ساتھی کے دل میں پھر خیال آیا کہ چل کر مورتی دیکھی جائے کہ تابوت میں ہے کہ نہیں۔ انہوں نے غار میں ایک مشعل روشن کر رکھی تھی۔ ڈاکو کے قدموں کی آہٹ سے شیبا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سوراخ میں سے دیکھا کہ شلانگو کا ساتھی دبے پاؤں تابوت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

شیبا ادا کاری کرنے کے لیے بالکل تیار ہو گئی۔

ڈاکو نے قریب آکر تابوت کو کھول دیا۔

تابوت کے کھلتے ہی شیبا نے ایک چیخ مار کر دونوں بازو ہوا میں پھیلا دیئے۔ ڈاکو ایک دم سے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا اور دیوی معاف کر دو۔ معاف کر دو—— کہتا ہوا سجدے میں گر گیا۔

چیخ کی آواز سن کر شلانگو سردار بھاگ کر غار میں آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک خوب صورت لڑکی دونوں بازو پھیلائے تابوت میں بیٹھی بڑی بڑی آنکھوں سے گھور رہی ہے۔ اور اس کا ساتھی ڈاکو سامنے زمین پر سجدے میں گرا ہوا ہے۔ شلانگو سمجھ گیا کہ اس کمینے نے "تابوت کا ڈھکنا اٹھادیا ہوگا اور دیوی اشرانی زندہ ہو گئی ہے۔

شلانگو نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"دیوی اشرانی! میرے ساتھی سے بھول ہو گئی۔ اسے معاف کر دو۔ اس کی خطا بخش دو۔"

شیبا نے کہا۔

"تم لوگوں نے مجھے ہزاروں سال کی نیند سے بے آرام کیا ہے۔ میں تم سے اس کا بدلہ لوں گی۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

شلانگو بھی جھک کر گھٹنوں کے بل گر گیا اور گڑگڑا کر بولا۔

"دیوی اشرانی! میں تمہارا خادم ہوں۔ میں نے تمہارا

تابوت نہیں کھولا۔ تابوت اس نے کھولا ہے۔ پھر مجھے سزا نہ دینا۔"

شیبا نے کہا۔

"میں تمہیں ایک شرط پر معاف کر سکتی ہوں کہ تم دونوں اونٹ پر سوار ہو کر اسی وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھو۔ یہاں تک کہ اس ملک سے نکل جاؤ۔ اگر تم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا عذاب تم دونوں کو وہیں زمین میں دفن کر دے گا۔"

دونوں ڈاکو ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔

"ہم جا رہے ہیں دیوی! تم نے ہماری جان بخشی کر دی ہے۔ ہم تمہارا شکریہ ادا کرتے ہیں۔"

شیبا نے تیز آواز میں کہا۔

"پلک بند کرو اور دفع ہو جاؤ میری آنکھوں کے سامنے سے۔ نہیں تو میں تمہیں آگ میں جلا کر راکھ کر دوں گی۔"

دونوں ڈاکو اٹھے اور تیزی سے غار میں سے باہر نکل آئے۔ اونٹ پر سوار ہوئے اور اونٹ کو بھگاتے ہوئے وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ شیبا نے غار کے منہ پر آکر دیکھا۔ ستاروں کی روشنی میں ڈاکوؤں کا اونٹ صحرا میں مشرق کی جانب بھاگا چلا جا رہا تھا۔

شیبا نے اطمینان کا سانس لیا اور غار میں واپس آکر زمین پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گئی۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ وہ سو گئی۔ ابھی اسے سوئے ایک

گھنٹہ ہوا تھا کہ ایک آواز نے اسے نیند سے بیدار کر دیا۔

شیبا نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ غار میں مشعل جل رہی تھی۔ اس کی روشنی غار کی دیواروں پہ پڑ رہی تھی اور پتھروں کے سائے لہرا رہے تھے۔ یہ آواز کیسی تھی؟ شیبا نے سوچا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، کیونکہ اسے پھر کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اسے خیال آیا کہ شاید یہ اس کا وہم تھا۔ اس نے اٹھ کر غار میں چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ غار خالی تھی۔ تابوت بھی اسی طرح خالی پڑا تھا۔

شیبا نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگی ــــ

کوئی دس منٹ کے بعد جبکہ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، اسے پھر وہی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی بہت نرمی اور محبت سے اس کا نام لے کر بلا رہا ہو ــــ شیبا ڈر کر اٹھ بیٹھی۔

اس نے کان لگا دیئے۔ آواز پھر آئی۔

"شیبا ــــ شیبا ــــ یہاں آؤ"

آواز کونے میں ان پتھروں میں سے آ رہی تھی جہاں اس نے سہ پہر کو مقدس مورتی دفن کی تھی۔ شیبا آہستہ آہستہ پتھروں کی طرف چلی۔ اس نے مشعل کی روشنی میں جھک کر دیکھا کہ سونے کی مورتی پتھروں میں پڑی تھی۔ وہ اپنے آپ زمین سے باہر آ گئی تھی۔ اس کا سارا جسم سونے کا تھا لیکن آنکھیں زندہ ہو گئی تھیں اور روشنی میں چمک رہی تھیں اور شیبا کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ پہلے تو شیبا ڈر کر پیچھے

ہٹ گئی۔

مقدس مورتی نے اسے محبت بھری آواز میں پکار کر کہا۔

"ڈرو نہیں شیبا ــــ"

شیبا نے پوچھا۔

"کیا ــــ کیا تم میرا نام جانتی ہو؟"

مقدس مورتی کے ہونٹ بالکل نہیں ہل رہے تھے۔ وہ سونے کے تھے مگر ان کے پیچھے سے آواز آ رہی تھی۔

"ہاں ــــ میں تمہارا نام بھی جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو"

شیبا نے کہا۔

"تو پھر مجھے واپس میرے گھر پہنچا دو۔ میں نے تین ہزار سال پرانے زمانے میں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے ــــ خدا کے لیے میری مدد کرو اور مجھے میرے ماں باپ کے پاس پہنچا دو"

مقدس مورتی کی آنکھیں شیبا کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔

"تمہیں واپس تمہارے زمانے کے شہر لاہور میں پہنچانا میرے بس میں نہیں ہے"

"تو کیا اب میں ساری زندگی ان صحراؤں میں بھٹکتی پھروں گی؟ کیا میں کبھی اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ سے

نہ جا سکوں گی؟"

شیبا نے ناامید ہو کر کہا۔ مقدس مورتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ غار میں گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر مقدس مورتی کی آواز آئی۔

"میں تمہاری صرف یہ مدد کر سکتی ہوں کہ تمہیں ملک روم میں پہنچا دوں۔"

شیبا نے کہا۔

"وہاں جا کر میں کیا کروں گی؟"

مقدس مورتی نے کہا۔

"ملک روم میں ایک پہاڑی ہے جس کا نام کہلان ہے۔ اس کہلان پہاڑی پر دیوی ڈیانا کا مندر ہے۔ اس مندر میں دیوی ڈیانا کا بہت بڑا بت ہے۔ اس بت کے اندر چھوٹی سی سیڑھی بت کی آنکھوں تک جاتی ہے۔ اس بت کی آنکھوں میں ایک سبز زمرد جڑا ہوا ہے۔ اگر تم کسی طرح وہ زمرد اکھاڑ کر اپنے پاس رکھ لو تو تم واپس جا سکو گی۔ لیکن یاد رکھو۔ اگر وہ زمرد ڈیانا کی آنکھ سے نکالتے ہوئے تمہارے ہاتھ سے گر گیا تو تمہارا آدھا دھڑ شیر کا بن جائے گا اور تم پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو جاؤ گی ——"

شیبا حیرانی سے مقدس مورتی کی باتیں سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ اور اس نے عنبر

کی انگوٹھی کو رگڑ کر کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ مگر اب وہ پھنس چکی تھی اور اسے وہی کرنا تھا جو اسے مقدس مورتی کہہ رہی تھی۔

مقدس مورتی نے شیبا کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"کیا تم یہ سب کچھ کرو گی شیبا؟"

"ہاں —— ضرور کروں گی"

اس کے منہ سے اپنے آپ نکل گیا۔ وہ اور کیا کہہ سکتی تھی۔

مقدس مورتی نے کہا۔

"اب تم یہاں سے ملک روم کی طرف نکل جاؤ"

شیبا نے کہا۔

"مقدس مورتی ملک روم یہاں سے کتنی دور ہے؟"

مقدس مورتی بولی۔

"اگر تم کسی قافلے کے ساتھ سفر کرو گی تو ایک مہینے میں پہنچ جاؤ گی"

شیبا کو یاد آیا کہ کراچی سے روم کے ائیر پورٹ تک جو ہوائی جہاز جاتے تھے وہ چھ گھنٹوں میں وہاں پہنچ جاتے تھے۔ مگر اب وہ ۱۹۵۳ء کے کراچی میں نہیں تھی بلکہ تین ہزار سال پہلے ملک مصر میں تھی۔ اور تین ہزار سال پہلے ملک روم میں جا رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"یہ تو بڑا لمبا سفر ہے دیوی!"

مقدس مورتی نے تھوڑی دیر غور کیا۔ پھر بولی۔

"پھر تم ایسا کرو کہ مجھے تابوت میں لٹا دو اور میرے ساتھ تم بھی لیٹ جاؤ۔ یہ تابوت تمہیں لے کر ملک روم پہنچ جائے گا۔"

شیبا نے پتھروں میں سے مقدس مورتی کو اٹھا کر تابوت میں لٹایا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔ اس نے تابوت بند کر دیا۔ جونہی تابوت کا ڈھکنا بند ہوا وہ زمین سے بلند ہو کر فضا میں تیرتا ہوا غار سے باہر نکل آیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا اور ستاروں کی روشنی پھیکی پڑ رہی تھی۔ تابوت زمین سے کوئی ساٹھ ستر فٹ بلند ہوا اور اس نے ایک طرف کو ہوا میں اڑنا شروع کر دیا۔

○

اب ہم واپس، لاہور چلتے ہیں۔

شیبا کے بنگلے میں عنبر چھت پر سو رہا ہے۔ صبح ہوئی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ بڑا حیران ہوا کہ اسے اتنی گہری نیند کیسے آ گئی۔ اس نے موتیے کے پھولوں کے باسی ہار کی طرف دیکھا۔ ان پھولوں کی خوشبو نے اسے مدہوش کر دیا تھا۔ اس نے پھولوں کو اٹھا کر نیچے باغ میں پھینک دیا۔ بنگلے میں شیبا کے ماں باپ اور بہن بھائی بھی اٹھ بیٹھے تھے اور ساری کوٹھی میں شیبا کو تلاش کیا جا رہا تھا مگر شیبا کہیں بھی نہیں تھی۔ پہلے تو ان لوگوں نے سوچا کہ وہ صبح کی سیر کو لارنس باغ کی طرف نکل گئی ہو لیکن جب صبح کے نو بج گئے اور شیبا واپس نہ آئی تو سب پریشان ہو گئے۔ عنبر بھی نیچے آ گیا۔

وہ بھی حیران تھا کہ شیبا راتوں رات کہاں غائب ہو گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شیبا آدھی رات کو اس کی انگوٹھی رگڑ کر تین ہزار سال پرانے مصر میں پہنچ کر مشکل میں پھنس چکی ہے۔

شیبا کے باپ کا برا حال تھا۔ یہ اس کی عزت و آبرو کا معاملہ تھا۔ عنبر نے اسے حوصلہ دیا مگر جب شیبا ہی وہاں نہیں تھی تو اس کے ماں باپ کو کیسے حوصلہ آ سکتا تھا؟ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جن لوگوں نے اسے پنجاب پبلک لائبریری کے باہر اغوا کرنے کی کوشش کی تھی وہی اسے اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ ماں الگ پریشان تھی۔ بہن بھائی الگ آنسو بہا رہے تھے۔ عنبر نے ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے کہا اس طرح رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو گا۔

"آپ لوگ شیبا کی گم شدگی کو راز میں رکھیں اور محلے اور رشتے داروں کو یہی بتائیں کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کوہ مری چلی گئی ہے۔ اس دوران میں ہم اسے تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے ——"

اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ عنبر نے شیبا کی تلاش شروع کر دی۔ وہ سارا دن لاہور شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں اور سپر مارکیٹوں میں چکر لگاتا رہا۔ مگر شیبا وہاں ہوتی تو اسے نظر آتی۔ اس سلسلے میں وہ جانتا تھا کہ اس کی طلسمی انگوٹھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ کیونکہ انگوٹھی اپنی مرضی کا منظر دکھاتی تھی اور پھر عنبر کو اپنی مرضی کے خلاف غائب ہونا پڑتا تھا۔

اسی طرح چھ روز گزر گئے اور شیبا کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ گھر والوں نے یہی مشہور کر دیا تھا کہ شیبا اپنی کالج کی سہیلیوں کے ساتھ پک نک منانے کوہ مری گئی ہوئی ہے۔ لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا گھر والے پریشان ہو رہے تھے کہ وہ رشتہ داروں کو کیا منہ دکھائیں گے؟

عنبر بھی بہت زیادہ پریشان تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے شیبا کی ایک چھوٹی سی تصویر جیب میں رکھی اور اس کے ماں باپ سے کہا۔

"میں شیبا کی تلاش میں شہر سے دور جا رہا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں بہت جلد اسے ساتھ لے کر واپس آجاؤں گا۔ یہ میں وعدہ کرتا ہوں میرے آنے تک آپ حوصلے سے کام لیں اور کسی سے شیبا کی گمشدگی کا ذکر نہ کریں"

شیبا کے باپ نے آہ بھر کر کہا۔

"بیٹا تم اسے کہاں ڈھونڈو گے؟"

عنبر نے کہا۔

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ مجھے صرف چار روز کی مہلت دے دیں"

اسی رات عنبر شیبا کے بنگلے سے نکل کر لارنس باغ کی پہاڑی کے اوپر آ کر کھلی جگہ پر بیٹھ گیا اور چاند نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ رات کے گیارہ بجے چاند نکلا اس کی روشنی چاروں طرف باغ میں پھیل گئی۔ عنبر نے اپنی انگوٹھی والی انگلی آنکھوں کے سامنے کی اور کہا۔

"اے طلسمی انگوٹھی! تو آج تک مجھے جہاں لے گئی میں چلا گیا۔ اب ایک باعزت شریف خاندان کی عزت کا معاملہ ہے۔ ان کی بچی گم ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کسی طلسم کی وجہ سے پرانے زمانے میں نکل گئی ہو۔ میرا بنر سہی۔ لیکن شیبا کے بوڑھے ماں باپ کا خیال کرتے ہوئے مجھے وہ جگہ دکھا دے اور مجھے اس جگہ پہنچا دے جہاں شیبا گئی ہے"

یہ کہہ کر عنبر نے انگوٹھی کو اپنی آستین سے رگڑا اور اس کے سرخ یاقوت کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ سرخ یاقوت میں لکیریں

ابھریں اور پھر عنبر کو ایک قدیم زمانے کا ایک چھوٹا سا شہر دکھائی دیا، جس کے بازاروں میں پرانے لباس پہنے لوگ آجا رہے تھے، اونٹوں کا ایک قافلہ شہر کے دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔ عنبر کی آنکھیں آپ آپ بند ہونے لگیں، پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ہوا میں بلند ہو گیا اور جب اس کے پاؤں دوبارہ زمین پہ لگے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ اسی پرانے شہر کے ایک بازار میں کھڑا تھا۔ اس کا اپنا لباس بھی اسی زمانے کے لوگوں ایسا بدل گیا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ شیبا کی پاسپورٹ سائز کی تصویر اس کی جیب میں موجود تھی۔ عنبر نے اس قدیم شہر کے بازاروں میں گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ وہ ہر عورت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ طلسمی انگوٹھی نے جو اسے اس شہر میں پہنچایا تھا تو عنبر کو یقین ہو گیا تھا کہ شیبا ضرور کسی طلسم کی وجہ سے ماڈرن زمانے سے نکل کر قدیم دور میں آگئی ہے۔

لیکن وہ حیران تھا کہ شیبا اس دور میں کیسے آگئی؟ یہ راز اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک کارواں سرائے میں پہنچا جہاں ایک قافلہ ابھی ابھی آکر رکا تھا اور مسافر اپنا سامان اتار رہے تھے۔ اس قافلے میں مصر کی ملکہ قلوپطرہ کے شاہی محل کا ایک پہرے دار بھی تھا، جو وہاں سے بھاگ آیا تھا۔

عنبر نے شیبا کی تصویر نکال لی تھی۔ اور ہاتھ میں چھپا کر رکھی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تصویر دیکھ کر لوگ ڈر جائیں گے اور اسے جادوگر سمجھنے لگیں گے۔ اس لیے کہ آج سے دو تین ہزار سال پہلے بھلا کیمرہ کہاں ہوتا تھا کہ کسی کی تصویر اتار سکتا۔ پھر بھی عنبر نے ہر حالت میں شیبا کو تلاش کرنا تھا۔ اس نے ایک آدمی سے پوچھا کہ اس شہر کا کیا نام ہے اور یہ کون سا زمانہ ہے؟ اس آدمی نے تعجب سے عنبر کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔

”بھائی کیا تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ یہ ملک فارس کا ایک قصبہ ہے اور اس وقت ملک فارس پر روم کے بادشاہ کی حکومت ہے“

عنبر نے ہاتھ بڑھا کر اس آدمی کو شیبا کی تصویر دکھائی اور کہا۔

”کیا تم نے اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے؟“

عنبر کے ہاتھ میں ایک عورت کی اصل کے برابر شکل دیکھ کر اس آدمی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور وہ ایک طرف کو بھاگ گیا۔ عنبر نے اس کا پیچھا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور قافلے کے ساتھ آنے والے اس سپاہی کی طرف متوجہ ہوا جو ملک مصر کے شاہی محل میں پہرے دار رہ چکا تھا اور اب جنگ کی وجہ سے وہاں سے بھاگ آیا تھا۔

دیوی ڈیانا کی آنکھ لاؤ

عنبر نہیں جانتا تھا کہ یہ شخص ملکہ قلوپطرہ کے شاہی محل میں پہریدار تھا۔ اس نے ویسے ہی اُسے ایک طرف لے جا کر کہا۔

" بھائی! میرے پاس ایک تصویر ہے جو ملک یونان کے ایک بڑے ماہر مصوّر نے بنائی ہے۔ یہ ایک لڑکی کی تصویر ہے جو تمہیں بالکل اصلی لگے گی۔ تم ڈرنا مت۔ یہ کوئی جادو کی شکل نہیں ہو گی۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا تم نے اس تصویر والی لڑکی کو کہیں دیکھا ہے؟ "

اور عنبر نے شیبا کی پاسپورٹ سائز کی تصویر اس کے سامنے کر دی۔ تصویر دیکھ کر پہلے تو وہ سپاہی ڈر گیا۔ کیونکہ اتنی صاف اور بالکل اصلی شکل ایسی تصویر اس نے پہلے زندگی بھر کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن جب عنبر نے اسے بہت سمجھایا تو اس نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ اس نے کہا۔

" یہ تو ملکہ قلوپطرہ کی خاص کنیز شاریان کی تصویر ہے

مگر اس نے یہ کیسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور کس طرح بال بنائے ہوئے ہیں "۔

کیونکہ شیبا کی یہ تصویر لاہور کے ایک فوٹو سٹوڈیو کی اتری ہوئی تھی اور اس کا لباس پاکستانی تھا اور بال بھی ہزاروں سال بعد کے فیشن کے بنے ہوئے تھے۔ اس لیے سپاہی حیران ہو رہا تھا۔ عنبر نے پوچھا۔

" کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ لڑکی اب کہاں ہو گی؟ "

سپاہی نے کہا۔

" ملکہ قلوپطرہ نے خود کشی کر لی ہے۔ شاہی محل پر روم کی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ سب کنیزیں اور شاہی پہریدار بھاگ گئے تھے۔ میں بھی وہاں پہرے دار تھا۔ میں نے اس کنیز کو کئی بار دیکھا تھا ——"

عنبر نے کہا۔

" کیا تمہیں کچھ اندازہ ہو گا کہ یہ کنیز بھاگ کر کدھر گئی ہو گی؟ "

سپاہی بولا۔

" کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تم فارس کے شہر شیرانہ میں جا کر اسے تلاش کرو۔ کیونکہ قلوپطرہ کی اکثر کنیزیں شیرانہ کی رہنے والی تھیں ——"

اتنا کہہ کر سپاہی وہاں سے چلا گیا۔ وہ زیادہ دیر عنبر سے گفتگو

نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے خود ڈر تھا کہ کوئی اسے پکڑ نہ لے۔

عنبر کو اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ شیبا ملک مصر میں تھی اور اسی دور میں کسی جگہ موجود ہو گی۔ شام کے وقت وہ ایک قافلے کے ساتھ شامل ہو کر شیراز کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس خیال سے کہ اگر وہاں کوئی کنیز پہنچی ہو گی تو اس سے شیبا کا ضرور پتہ چل جائے گا۔

○

ادھر شیبا تابوت میں بیٹھی ہوا میں اڑی جا رہی تھی۔ مقدس مورتی بھی اس کے پاس ہی لیٹی ہوئی تھی۔ ہزاروں کوس کا فاصلہ انہوں نے ایک ہی دن میں طے کر لیا اور شام کا اندھیرا پھیلتے ہی تابوت ملک روم کی کھلان پہاڑی کے دامن میں ایک باغ میں اتر پڑا۔

مقدس مورتی نے شیبا سے کہا۔

"اب تم تابوت سے نکل کر سبز زمرد حاصل کرنے کے لیے پہاڑی پر ڈیانا دیوی کے مندر میں جاؤ۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں ہر وقت زبردست پہرہ ہوتا ہے لیکن یہ کام صرف تمہیں ہی کرنا ہو گا۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گی ———"

شیبا نے مقدس مورتی کا شکریہ ادا کیا اور تابوت سے باہر آ گئی،

اس کے باہر آتے ہی تابوت ہوا میں بلند ہوا اور آسمان کی بلندیوں میں اڑتا ہوا غائب ہو گیا ——— شیبا کچھ دیر اسے آسمان میں غائب ہوتا دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پہاڑی کے اوپر بنے ہوئے مندر کو دیکھا۔ یہ بہت بڑا مندر تھا اور بے شمار سفید ستونوں پر کھڑا تھا۔

شیبا پہاڑی پر چڑھنے لگی تو کچھ لڑکیاں اس کے قریب سے گزریں انہوں نے پھولوں کے ہار اٹھا رکھے تھے اور وہ مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں۔ شیبا کی طرف دیکھ کر ایک لڑکی مسکرائی اور اس سے پوچھا۔

"تم بھی ملک مصر کی لگتی ہو؟"

شیبا نے کہا۔

"ہاں بہن ——— میں مصر کے شہر ایلام کی رہنے والی ہوں۔ میرا باپ ماہی گیر تھا۔ وہ جنگ میں مارا گیا۔ اب میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ ملک روم میں آئی ہوں کہ یہاں کسی کی کنیز بن کر زندگی کے دن گزاروں گی۔"

سب لڑکیاں شیبا کے اردگرد آ کر کھڑی ہو گئیں۔ شیبا کی معصومیت اور خوب صورتی نے ان پر اثر کیا تھا۔ وہ لڑکی بولی۔

"تم میرے پاس ٹھہر جاؤ۔ میں تمہیں مندر میں کام دلا دوں گی ——— آؤ ———"

شیبا کو اور کیا چاہیئے تھا؟ اس نے لڑکی سے کہا۔

"تمہارا بہت۔ بہت شکریہ بہن"

وہ لڑکی بولی۔

"میرا نام زرکسان ہے۔ اور تمہارا نام؟"

شیبا کے منہ سے اپنا اصلی نام نکل گیا۔

"شیبا"

سب لڑکیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔

"یہ تو یمن کی ملکہ کا نام تھا"

زرکسان نے کہا۔

"اور میری سہیلی بھی تو ملکہ یمن سے کم خوب صورت نہیں ہے۔ آؤ شیبا —"

اور زرکسان نے شیبا کو ساتھ لیا اور مندر کے باہر بنے ہوئے ایک مکان میں لے گئی۔ اس مکان میں زرکسان اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے شیبا کو بتایا کہ وہ مندر میں دیو داسی ہے اور مندر میں پجاریوں کی خدمت کرتی ہے اور مندر کی دیکھ بھال کرتی ہے

"کیا تم بھی دیو داسی بنو گی؟ تمہیں کھانے پینے کو سب کچھ ملے گا"

یہی شیبا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔

"مجھے اس سے زیادہ کیا چاہیئے؟ میں تیار ہوں"

زرکسان نے شیبا کو ڈیانا دیوی کے مندر میں دیو داسی بنا دیا۔ پہلے ہی دن شیبا نے گھوم پھر کر سارے مندر کا جائزہ لیا اور ڈیانا دیوی کے بت کو بھی دیکھا۔ یہ بہت بڑا بت تھا اور اس کے اندر ایک سیڑھی بت کی آنکھوں تک چلی گئی تھی۔ زرکسان دیو داسی ہر روز شام کو دیوی ڈیانا کی آنکھوں میں جا کر شمع روشن کرتی تھی۔ شیبا نے دیکھا کہ بت کی آنکھوں میں زمرد جڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک زمرد شیبا نے حاصل کرنا تھا اور وہ اسی مقصد کو لے وہاں آئی تھی۔

مندر میں آئے شیبا کو تیسرا روز تھا کہ شیبا نے اپنی سہیلی زرکسان سے کہا کہ اس کی بڑی خواہش ہے کہ وہ خود دیوی ڈیانا کی آنکھوں میں پہنچ کر شمع روشن کرے۔ زرکسان نے کہا۔

"یہ کام تو صرف میں کرتی ہوں۔ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا شیبا — صدیوں سے دیوی کی آنکھوں میں شمع جلانے کا کام ہمارا خاندان کرتا آ رہا ہے"

شیبا نے کہا۔

"زرکسان! تم میری پیاری سہیلی ہو۔ تم نے پہلے بھی مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ اصل میں میرے باپ نے منت مانی تھی کہ وہ دیوی کی آنکھوں میں جا کر شمع روشن کرے گا۔ مگر موت نے اسے مہلت نہ دی۔ اب میں اپنے باپ کی

منت پوری کرنی چاہتی ہوں اگر تم مجھے شمع جلانے کی اجازت دے دو تو میں تمہارا یہ احسان بھی ساری زندگی یاد رکھوں گی۔"

ٹرکسان کچھ دیر تو خاموش رہی۔ سوچتی رہی۔ پھر شیبا کی طرف مسکرا کر بولی۔

"بہت اچھا۔ آج رات تم شمع روشن کرو گی"

شیبا بے حد خوش ہوئی اس نے اپنی سہیلی کو گلے لگا لیا۔ وہ بے تابی سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ خدا خدا کر کے سورج غروب ہوا اور شام کے اندھیرے نے اپنی چادر چاروں طرف پھیلا دی۔ ٹرکسان نے شیبا کو اپنے خاص کپڑے پہنائے جلتی ہوئی چھوٹی مشعل ہاتھ میں دی اور دیوی ڈیانا کے بُت کے اندر بنی ہوئی تنگ پتھریلی سیڑھیوں تک لے جا کر بولی۔

"دیوی کی آنکھوں میں شمع روشن کر کے فوراً نیچے آ جانا اور کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر مت دیکھنا ـــــ"

"تم فکر نہ کرو ٹرکسان ـــــ"

اور شیبا مشعل لے کر دیوی ڈیانا کے بُت کے اندر اوپر کو جاتی تاریک اندھیری سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ سیڑھی اتنی تنگ تھی کہ شیبا کا جسم بت کی دیوار سے چھو رہا تھا۔ چڑھتے چڑھتے وہ دیوی کی گردن تک آ گئی۔ پھر اُسے دیوی کے بُت کی آنکھوں کے بڑے

بڑے سوراخ دکھائی دیئے جن کے درمیان دو شمعیں رکھی تھیں۔ کناروں پر سبز رنگ کے زمرّد لگے ہوئے تھے۔ ان زمردوں میں سے ایک زمرّد اس نے نکال لینا تھا۔ پھر اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا اس کی شیبا کو کوئی خبر نہیں تھی۔ کیونکہ مقدس عورت نے اسے یہی کہا تھا کہ تم زمرد نکالنے میں کامیاب ہو گئیں تو پھر تمہارا واپس اپنے شہر جانے کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ شیبا بُت کی آنکھوں کے پاس آ کر رک گئی۔

اس نے مشعل آگے جھکا کر آنکھوں کی دونوں شمعیں روشن کر دیں۔ اب سب سے بڑا اور خطرناک مرحلہ باقی تھا۔ اسے بُت کی آنکھ میں سے زمرّد کو اکھاڑنا تھا اور اس بات کا بھی خیال رکھنا تھا کہ زمرّد اس کے ہاتھ سے گر نہ پڑے۔

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ مگر اس کے دل میں ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملنے کا جذبہ اس قدر طاقتور اور شدید تھا کہ شیبا نے بڑے اعتماد کے ساتھ ہاتھ بڑھایا اور بت کی ایک آنکھ کے اوپر لگا ہوا سبز زمرد جھٹکے کے ساتھ اکھاڑ لیا

زمرد کا اکھڑنا تھا کہ ایک زلزلہ سا آ گیا۔

دیوی کا بت شیبا کو ڈولتا ہوا محسوس ہوا۔ مگر اس نے زمرد کو اپنی مٹھی میں خوب زور سے بھینچ رکھا تھا اور وہ اسے کسی قیمت پر گرنے نہیں دے رہی تھی۔ اگرچہ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے

کوئی نہیں طاقت اس کی مٹھی کھول کر زمرد چھیننے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر شیبا زمرد کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔

اب شیبا کو چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اور اس کے ہاتھ کو لگنے والے جھٹکے کم ہو گئے اور کسی نے جیسے اسے بت میں سے نکال کر اوپر پہاڑی پر لا کھڑا کیا اور پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ اس بیہوشی میں اسے احساس ہو رہا تھا جیسے کوئی خواب کی دنیا میں اسے تخت پر بٹھائے اڑائے لیے جا رہا ہے۔ جب شیبا کو ہوش آیا تو سب سے پہلے اس نے اپنی مٹھی کو دیکھا۔ زمرد غائب تھا۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔

وہ اندھیرے میں تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ اندھیرا اس کا جانا پہچانا ہے۔ وہ ایک پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اور چھت کے ساتھ پنکھا چل رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور خوشی سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے کمرے میں شادمان والی کوٹھی میں تھی۔ چیخ کی آواز سن کر اس کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بھاگ کر اندر آئی۔ شیبا نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ ماں نے بیٹی کو اور بیٹی نے ماں کو دیکھا تو ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ کوٹھی میں سارے بہن بھائی جاگ پڑے۔ سب شیبا سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔ شیبا واپس آ گئی تھی۔ کیسے آئی تھی؟ وہ کہاں تھی؟ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

پہلی بات شیبا نے پوچھی کہ عنبر کہاں ہے؟ اس کے باپ اسے بتایا کہ وہ اس کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔ شیبا نے دوسرا سوال یہ کیا کہ اسے گھر گئے کتنے دن ہو گئے ہیں؟ شیبا کی ماں نے اس سے کہا۔

” بیٹی! آج تجھے گھر سے غائب ہوئے آٹھواں روز جا رہا ہے۔ مگر خدا کے لیے ہمیں یہ بتاؤ کہ یہ سب کچھ کیا ہوا! تم کہاں چلی گئی تھیں۔ اور پھر اچانک کیسے اپنے پلنگ پر واپس آ گئیں؟“

شیبا نے کہا۔

” اماں میں تجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتی کہ ایک پری مجھ پر مہربان ہو گئی تھی۔ وہ مجھے سات کو اڑا کر اپنے ساتھ کوہ قاف میں لے گئی۔ جہاں میں دوسری پریوں کے ساتھ مل کر زمرد کے ایک شاندار محل میں رہی اور جب میں بہت زیادہ اداس ہو گئی تو پری مجھے یہاں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔“

اس کے باپ نے کہا۔

” بیٹا یہ کہانی کسی اور کو مت سنانا۔ کیونکہ ہم نے یہاں سب کو یہی بتایا ہوا ہے کہ تم اپنی کالج کی سہیلیوں کے ساتھ پکنک منانے کوہ مری گئی ہوئی ہو ——“

شیبا نے مسکرا کر کہا۔

"میں یہی بتاؤں گی ابا جان — لیکن کیا آپ کو میری بات پہ یقین نہیں آیا کہ میں پریوں کے دیس سے ہو کر آ رہی ہوں؟"

اس کے باپ نے کہا۔

"بیٹیا اب تم دودھ پی کر آرام کرو، صبح باتیں کریں گے"

شیبا کی ماں نے اسے دودھ پلایا — اور شیبا گہری نیند سو گئی۔ صبح اٹھ کر جب اس نے اپنی چھوٹی بہن کو بتایا کہ وہ ملکہ مصر قلوپطرہ کے شاہی محل میں اس کی خاص کنیز تھی اور اس کا نام شاریان تھا اور اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ملکہ قلوپطرہ کو خودکشی کرتے دیکھا ہے تو اس کی بہن نے کہا۔

"باجی! خدا کے لیے یہ باتیں کسی دوسرے کے سامنے نہ کرنا۔ نہیں تو لوگ تمہیں پاگل سمجھیں گے"

شیبا نے کہا

"میں سچ کہتی ہوں۔ میں نے خود سانپ لا کر ملکہ قلوپطرہ کو دیا تھا"

"باجی! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو"

اور شیبا خاموش ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں وہ خیال ہی خیال میں وہ منظر دیکھ رہی تھی کہ ملکہ قلو

اپنے شاہانہ پلنگ پر لیٹی ہے۔ سانپ اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ خودکشی کرنے والی ہے — شیبا دل میں بہت خوش تھی کہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو گئی اور اس نے ایک ایسا تجربہ کیا ہے جو شاید ہی اس دنیا میں اس کی کسی سہیلی کو نصیب ہو۔ مگر اب اسے عنبر کی فکر تھی کہ وہ اس کی تلاش میں کہاں نکل گیا ہو گا۔

○

عنبر شیبا کی تلاش میں شیراز پہنچ چکا تھا۔

شہر کے باہر اس نے ایک خانقاہ دیکھی جس کے گنبد پر ایک نیلے رنگ کا مور بیٹھا ہوا تھا۔ عنبر کو یہ نیلے رنگ کا مور بڑا پیارا لگا۔ وہ خانقاہ کے دروازے پر آیا تو اس کو اندر سے کسی نے آواز دی۔

"اندر آ جاؤ بیٹا۔"

عنبر خانقاہ میں داخل ہو گیا۔ اندر زمین پر قالین بچھا تھا اور ایک بزرگ صورت انسان قالین پر سر جھکائے آنکھیں بند کیے خاموش بیٹھا تھا۔ عنبر اس کے قریب ادب سے جا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد بزرگ نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر نور برس رہا تھا۔ عنبر سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑا پارسا پرہیزگار اور عبادت گزار بزرگ ہے۔

عنبر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس بزرگ نے مسکرا کر کہا۔

"بیٹا! تم جس لڑکی کی تلاش میں یہاں آئے ہو وہ تو تمہاری جیب میں ہے"

عنبر کو احساس ہوا کہ یہ شخص کوئی دل کا حال جاننے والا بزرگ ہے۔ کیونکہ شیبا کی تصویر عنبر کی جیب میں تھی۔ عنبر نے کہا۔

"اے بزرگ! پھر مجھے یہ بتا دیں کہ جس کی تصویر میری جیب میں ہے وہ مجھے کہاں ملے گی؟"

بزرگ نے کہا۔

"یہ تم تصویر سے کیوں نہیں پوچھتے؟"

"جی؟" عنبر نے تعجب سے پوچھا۔

بزرگ بولا۔

"تم تصویر سے پوچھو کہ وہ کہاں ہے؟"

عنبر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے جیب سے شیبا کی تصویر نکال کر دیکھی تو ایک دم چونک پڑا۔ تصویر میں اس نے شیبا کی لاہور والی کوٹھی دیکھی جس کے لان میں شیبا اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اسے شیبا کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی مگر شکل اور منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

بزرگ نے کہا۔

"بیٹا! جس لڑکی کی تم تلاش میں ہو وہ تو اپنے گھر پہنچ بھی چکی ہے"

"مگر ـــــ مگر کیسے بابا جی؟"

بزرگ بولا۔

"خدا کی مرضی سے۔ اور جب خدا کی مرضی ہوتی ہے تو ہر کام سیدھا ہو جاتا ہے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ لڑکی اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھی ہنسی خوشی ناشتہ کر رہی ہے"

عنبر نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھا۔ اب تصویر کا منظر دھندلا ہونے لگا تھا اور پھر دھندلا ہوتے ہوتے ایک دم سارا منظر غائب ہو گیا اور پھر تصویر بھی اس کے ساتھ غائب ہو گئی۔ وہ بزرگ کی طرف دیکھنے لگا۔ بزرگ نے کہا۔

"اب تمہیں اس تصویر کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے وہ واپس چلی گئی ہے"

عنبر نے کہا۔

"بابا جان! کیا آپ مجھے بھی شیبا کے پاس پہنچا سکتے ہیں؟"

بزرگ نے کہا۔

"بیٹا! یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے"

عنبر نے پھر سوال کیا۔

”بابا جان! اگر آپ مجھے شیبا کے پاس نہیں پہنچا سکتے تو کیا ناگ اور ماریا اور کیٹی کا کچھ پتہ بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہیں؟ اور کیا میں ان کے پاس جا سکتا ہوں؟“

بزرگ نے سر جھکا لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آنکھیں بند کئے کسی زبردست طاقت سے اجازت لے رہا ہے۔ پھر اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تو اس کے چہرے پر مایوسی کے ہلکے ہلکے سائے تھے۔ اس نے کہا۔

”بیٹا! یہ بات بھی میرے اختیار میں نہیں کاش میں تمہیں ان کے پاس پہنچا سکتا۔ مگر مجھے اس کی اجازت نہیں ملی۔“

عنبر سخت مایوس ہو گیا تھا۔ مگر بزرگ نے اسے کہا۔

”بیٹا! دنیا میں کسی بات سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ مایوسی گناہ ہے۔ جیسے خدا نے شیبا کو اس کے ماں باپ سے ملا دیا ہے وہ تمہیں بھی ناگ ماریا سے ملا دے گا۔ صرف تمہیں صبر سے کام لینا ہوگا جس طرح کہ تم لوگ ہمیشہ صبر سے کام لیتے رہے ہو ——— ہاں۔ اتنا میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ ناگ ماریا اور کیٹی ——— تینوں اس وقت ایک ہی ملک میں ہیں ——— فرق صرف اتنا ہے کہ دو زمین کے اوپر ہیں اور ایک زمین کے اندر ہے۔“

زمین کے اندر کا سن کر عنبر اور زیادہ پریشان ہوا کہ آخر

زمین کے اندر ان میں سے کون ہوگا؟ اور وہ زمین کے اندر کہاں ہوگا۔ بزرگ کی مراد ناگ سے تھی ——— کہ وہ اس وقت ۱۹۸۴ء کے ملک بھارت کے جنوب میں پرانے قلعہ پانڈیچری کے پاس جو باؤلی تھی اس کے نیچے شہزادی سلومی کی قید میں تھا اور اس کے ساتھ ناگ کی شادی ہونے والی تھی ——— اور ماریا اور کیٹی اس ملک میں ریل گاڑی میں سوار مدراس سے دلی پہنچنے کے بعد اب دلی سے پاکستان کے شہر لاہور کی طرف چلی آ رہی تھیں۔ کیونکہ انہیں سرحد عبور کر کے لاہور میں گارڈن ٹاؤن والے اپنے دوست سٹوڈنٹ امجد سے مل کر عنبر کے بارے میں پوچھنا تھا۔

بزرگ اتنا بتا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور عنبر کو خانقاہ سے باہر لے آیا۔

”اب یہاں سے تم سیدھے ملک افریقہ کی طرف جاؤ گے۔ خدا نے چاہا تو وہاں پہنچ کر تمہارا اپنے بہن بھائی سے ملنے کا کوئی سلسلہ بن جائے گا ———“

بزرگ واپس خانقاہ میں چلا گیا۔ بزرگ کے پاس واپس جا کر اب کچھ پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے جو کچھ بتانا تھا بتا دیا تھا۔ عنبر نے بزرگ کو سلام کیا اور مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی منزل ملک افریقہ تھا جہاں پہنچ کر بزرگ کے کہنے کے مطابق عنبر کو امید تھی کہ اس کی ناگ، ماریا سے ملاقات کا کوئی ذریعہ نکل آئے گا۔

○

ناگ اس وقت بھارت کے شہر ترلام کے پاس قلعہ پانڈی چری کے قریب پانی کی باؤلی کے نیچے شہزادی سلومی کے محل میں ہے۔ اس کی شادی سلومی سے ہو گئی ہے اور وہ محل میں شہزادہ بن کر رہ رہا ہے مگر ایک طرح سے وہ وہاں قیدی ہے۔ وہ محل سے قدم باہر نہیں رکھ سکتا۔ اس کی ساری طاقت اسے واپس مل چکی ہے مگر شہزادی سلومی ایک ایسی زبردست جادوگرنی ہے کہ اس پہ ناگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور ناگ کوئی بھی روپ بدل کر وہاں سے باہر نہیں جا سکتا۔

شہزادی سلومی کی پُراسرار موکلہ یا اس کی ہم راز شہزادی کی حفاظت کرتی ہے۔ ناگ نے باتوں ہی باتوں میں کئی بار شہزادی سلومی سے کہا کہ وہ اس کی پُراسرار موکلہ سے ملاقات کرائے مگر شہزادی سلومی نے ایسا کرنے سے ہر بار انکار کیا تھا اور آخری بار جب ناگ نے اصرار کیا تو شہزادی نے سختی سے کہا تھا۔

"ناگ! یہ مت سمجھنا کہ تم میرے خاوند ہو اور میں تمہاری بیوی ہوں۔ تم کو ایک خاص مقصد کے لیے میں اپنی دنیا میں زمین کے اندر لائی ہوں۔ اور تم کو یہاں میرے غلام اور قیدی بن کر زندگی بسر کرنی ہے۔ آئندہ اگر تم نے میری موکلہ کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال کیا یا مجھے پتہ

چلا کہ تم اس کی ٹوہ میں ہو تو میں تمہیں اسی شاہی محل کے ایسے اندھیرے تہہ خانے میں بند کر دوں گی جہاں سے تم قیامت تک باہر نہ نکل سکو گے ــــ"

یہ سن کر ناگ خاموش ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ شہزادی کے آگے بے بس تھا۔ اس کی طاقت کے آگے ناگ کی ایک نہ چلتی تھی اور وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے ایک ہی امید تھی ــــ یعنی شہزادی سلومی کی وہ پُراسرار موکلہ جو اس کی مدد کرتی تھی اور اس کی طاقت کا اصل خزانہ تھا ــــ ناگ نے اوپر سے تو ظالم شہزادی سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کی پُراسرار موکلہ کے بارے میں آئندہ کبھی کوئی سوال نہیں کرے گا لیکن دل میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس کا ہر حالت میں سراغ لگا کر رہے گا۔

○

دوسری طرف ماریا اور حلوائی لڑکی ٹرین میں سوار تھیں۔

اور ٹرین دلّی سے امرتسر کی طرف اڑی چلی آ رہی تھی۔ اس ٹرین کا نام جنتا ایکسپریس تھا اور ماریا اور کیٹی فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس ڈبے میں ایک ہندو عورت بھی اپنے دودھ پیتے بچے کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ وہ ماریا کو تو نہیں دیکھ سکتی تھی مگر کیٹی کے ساتھ وہ راستے بھر باتیں کرتی آتی تھی۔ اس عورت کا نام رام دُلاری تھا۔ وہ امرتسر کے ایک کروڑپتی

سوداگر کی بیوی تھی اور اس نے سونے کے بڑے گہنے پہن رکھے تھے اور اس کے پاس ایک سوٹ کیس بھی تھا جو قیمتی زیورات اور کپڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ کیٹی نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا کیونکہ اس وقت وہ اپنی اصلی سنہرے بالوں والی خوب صورت لڑکی کے روپ میں تھی اور اس کی آنکھیں چوکور تھیں۔ ان چوکور آنکھوں کو چھپانے کے لیے اس نے سیاہ چشمہ آنکھوں پر چڑھا رکھا تھا۔

یہ ہندو عورت بہت باتونی تھی اور کھاتی بھی بہت تھی۔

کیٹی سے اس نے کئی بار پوچھا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہی ہے۔ کیٹی نے کہا تھا۔

"میں عیسائی لڑکی ہوں۔ میرا نام پامیلا ہے اور میرا باپ امرتسر چھاؤنی میں ٹریفک انسپکٹر ہے میں اسے ملنے جا رہی ہوں"

اس عورت کی وجہ سے کیٹی ماریا سے بھی کھل کر بات نہیں کر سکتی تھی۔ اسے جب بھی ماریا سے کوئی بات ہوتی تو وہ چپکے سے غسل خانے میں چلی جاتی تھی اور اندر جا کر اس سے بات کرتی تھی۔

"اس رام دلاری کی بچی نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے ہے۔ بڑی باتیں کرتی ہے"

ماریا ہنسنے لگی۔

"میری طرح تم بھی غائب رہا کرو۔ بڑا مزہ رہتا ہے۔ کم از کم رام دلاری ایسی عورتیں اپنی چڑ چڑ باتوں سے بور تو نہیں کرتیں"

کیٹی نے کہا۔

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہے ورنہ میں بھی تمہاری طرح غائب ہو جاتی"

ماریا نے کہا۔

"تم کیوں نہیں غائب ہو سکتیں؟ تم میرا تصور دماغ میں لا کر چٹکی بجا کر تو دیکھو"

کیٹی مسکرا کر بولی۔

"تمہاری اصلی شکل ذہن میں لا کر جب میں چٹکی بجاؤں گی تو تمہاری شکل کی بن جاؤں گی۔ اور غائب ہونے کے لیے تمہاری غیبی شکل کو دماغ میں رکھ کر چٹکی بجانا ضروری ہے اور تمہاری غیبی شکل کو میں نے آج تک نہیں دیکھی اور نہ دیکھ سکتی ہوں"

ماریا نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے ـــــ تو پھر رام دلاری کی باتیں برداشت کرو"

"میں تو حیران ہوں کہ یہ اتنا قیمتی اور ڈھیر سارا سونے

کا زیور لے کر کیسے اکیلے گھر سے نکل پڑیں۔ کیا انہیں خیال نہیں ہوتا کہ راستے میں ڈاکو بھی پڑ سکتا ہے"

ماریا بولی۔

"یہ ۱۹۸۴ء کا زمانہ ہے کیٹی — آج کل اتنے ڈاکے نہیں پڑتے جتنے پرانے زمانے میں پڑا کرتے تھے"

کیٹی نے سر جھٹک کر کہا۔

"ارے نہیں ماریا بہن! وہ زمانے بہت اچھے تھے۔ آج کل اس زمانے سے زیادہ ڈاکے پڑتے ہیں اور زیادہ ظالم لوگ رہتے ہیں —"

کیٹی غسل خانے میں ماریا سے باتیں کر رہی تھی کہ اچانک اسے ڈبے میں سے رام دلاری کی چیخ سنائی دی۔ ماریا نے کہا۔

"میرا خیال ہے ڈاکو آ گیا ہے کوئی۔"

کیٹی جلدی سے غسل خانے سے باہر نکلی تو دیکھا کہ رام دلاری کونے میں سیٹ پر سہمی ہوئی بیٹھی ہے۔ رنگ زرد ہو رہا ہے اور بچے کو سینے سے لگایا ہوا ہے۔

"کیا ہوا؟" کیٹی نے پوچھا۔

وہ رک رک کر بولی۔

"کوئی باہر ہے"

طوفان میل کے ڈاکو

"کون کہاں ہے؟"

کیٹی نے پوچھا۔ رام دلاری نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایک خوفناک شکل والے آدمی نے شیشے میں سے جھانک کر اندر دیکھا تھا"

"اس کھڑکی کے شیشے میں سے؟"

"ہاں —"

کیٹی نے کھڑکی کا شیشہ اوپر اٹھا کر باہر دیکھا۔ باہر اندھیرا گھپ تھا۔ اس کے بال تیز ہوا میں اڑنے لگے۔ گاڑی ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طوفان میل کی طرح اڑی جا رہی تھی۔ کیٹی نے شیشہ گرا دیا اور بولی۔

"نہیں وہم ہوا ہے۔ باہر تو کوئی نہیں۔ پھر اتنی تیز بھاگتی ہوئی ٹرین میں کیسے کوئی اندر آ سکتا ہے؟"

کیٹی کو نہیں معلوم تھا کہ اس ملک میں ڈاکوؤں کے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔ وہ چٹانوں کی چوٹیوں پر اور سمندروں کے نیچے

بھی پہنچ جاتے ہیں۔ اور چلتی ریل گاڑیوں میں ڈاکے ڈالنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ وہ چلتی ٹرین میں ایک ڈبے کے پائیدان پر آ جاتے ہیں اور یہی ہوا ——— کیٹی شیشے کی کھڑکی کھسکا کر اپنی سیٹ پر بیٹھی ہی تھی کہ پیچھے دروازے کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور دھڑام دھڑام کرتے تین نقاب پوش ڈاکو پستولیں تانے اندر آ گئے۔ رام دُلاری چیخیں مارنے لگی۔ اس کا بچہ بھی رونے لگا۔

ایک ڈاکو پستول لے کر کیٹی کے سر پہ کھڑا ہو گیا اور دوسرے نے رام دُلاری کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور کہا۔

"حرام زادی! چپ رہ"

رام دلاری کا وہیں سانس خشک ہو گیا اور وہ چپ ہو گئی۔ کمال کی بات ہے کہ اس کا چھوٹا بچہ بھی ماں کے ساتھ ہی ایک دم چپ ہو گیا۔

ایک ڈاکو پستول رام دُلاری کی کنپٹی کے ساتھ لگا کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے نے اس کے گلے اور کانوں سے زیور اتارنا شروع کر دیا ——— کیٹی نے کہا۔

"ماریا! تم کیا تماشہ دیکھ رہی ہو؟"

کیٹی کے سر پہ جو ڈاکو کھڑا تھا اس نے کیٹی کے سر پہ مکا مارا اور کیٹی کی عینک آنکھوں سے نیچے گر پڑی۔ کیٹی نے اپنی چوکور

آنکھیں ڈاکو کی طرف اٹھا کر کہا۔

"کیا میں اپنی عینک اٹھاؤں؟"

ڈبے میں بتی جل رہی تھی۔ اس کی روشنی میں ڈاکو نے جو کیٹی کی نیلی چوکور آنکھوں کو دیکھا تو اس کا سارا جسم دہشت سے ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔

"شامو! ارے یہ چڑیل ہے کوئی"

دوسرے ڈاکو نے ہوا میں فائر کر دیا۔ ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ رام دلاری کی ایک بار پھر چیخ نکل گئی۔ اس نے اسے موٹی سی گالی دے کر کہا۔

"ارے اس چڑیل اپنی ماں کو گولی مار دے رے"

اور پہلے والا ڈاکو گولی مارنے ہی لگا تھا کہ ماریا نے اس کی کلائی زور سے ہاتھ مارا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ماریا نے پستول اٹھا لیا۔ ماریا کے ہاتھ میں پستول جاتے ہی غائب ہو گیا۔

"شامو! رے ایک اور چڑیل ہے رے یہاں"

دوسرا ڈاکو شامو زیور اتار کر رام دلاری کے بکس میں سے بھی زیور نکال رہا تھا۔ تیسرا ڈاکو رام دلاری کی گردن پہ پستول رکھے ہوئے تھا۔ شامو ڈاکو نے کہا۔

"ارے حرام زادے۔ اس دوسری چڑیل کو بھی گولی مار دے ———"

لیکن ماریا اب اس کے سر پہ آگئی تھی۔

ماریا نے شامو ڈاکو کے قریب جاکر سرگوشی کی۔

" میں تمہاری ماں چڑیل تمہاری جان نکالنے آگئی ہوں "

شامو ڈاکو کے ہاتھ سے زیور نیچے گر پڑے۔ وہ اچھل کر اٹھا اور پستول نکال کر اس نے ماریا کی آواز کا نشانہ باندھ کر تین چار فائر کر دیئے۔ گولی ماریا کے اندر سے نکل کر ٹرین کی دیوار سے ٹکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ماریا کو بڑا غصہ آیا کم بخت کا نشانہ کمال کا تھا اور پھر اس نے ایک دم ماریا کو قتل کرنے پہ عمل شروع کر دیا تھا۔

ماریا نے اس کے پستول والے ہاتھ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ شامو ڈاکو گولیاں چلانے کے بعد اِدھر اُدھر ڈبے میں تک رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ڈاکو ساتھیوں سے کہا۔

" ارے یہ سونے کے زیور اٹھا کر زنجیر کھینچ دو۔ ٹرین کی رفتار ہلکی ہو تو چھلانگیں لگا دو رے حرام زادو "

پھر اچانک اس کے ہاتھ سے کسی نے پستول چھین لیا اور وہ اپنے خالی ہاتھوں کو حیرانی سے تکنے لگا۔ ماریا نے کہا۔

" تم حرام زادو اب اس ٹرین سے چھلانگیں نہیں لگا سکو گے "

کیپٹن نے جلدی سے اپنا سیاہ چشمہ آنکھوں پر چڑھا لیا تھا۔

ماریا کی آواز سن کر سارے ڈاکو گھبرا گئے۔ رام دُلاری کا تو پہلے ہی خوف سے برا حال ہو رہا تھا۔ اب جب اسے معلوم ہوا کہ ٹرین میں کوئی چڑیل آگئی ہے تو اس کا دم اور خشک ہو گیا۔ لیکن ایک بات کی اسے تسلی تھی کہ یہ چڑیل اس کی مدد کرنے آئی تھی۔

تیسرے ڈاکو کے پاس ابھی تک پستول تھا۔ کیپٹن نے بھی پستول زمین سے اٹھا لیا تھا۔ اس نے تیسرے ڈاکو کی طرف پستول تان رکھا۔

" پستول نیچے پھینک دے ——"

شامو نے کہا۔

" پستول مت پھینکنا ——"

ماریا نے تیسرے ڈاکو کی گردن پہ آہستہ سے ہاتھ مارا۔ وہ ہائے کر کے نیچے گر پڑا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ماریا نے اسے بھی اٹھایا اور پستول اس کے ہاتھ میں آتے ہی غائب ہو گیا۔

ڈاکوؤں کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بوکھلا سے گئے تھے۔ ماریا نے زنجیر کھینچ دی۔ ڈبے کو ایک دم سے زبردست بریک لگی اور وہ رکنے لگا۔

ڈاکو کھڑکی سے چھلانگ لگانے کے لیے بھاگے ہی تھے کہ ماریا نے ایک ایک کر کے تینوں کی گردنوں پہ ایسے مکے مارے کہ وہ ڈبے کے فرش پر اوندھے ہو کر گر پڑے اور ہائے ہائے کرنے

لگے۔

ٹرین جنگل میں رک گئی۔ گارڈ پولیس کو لے کر ڈبے میں آگیا۔ رام دُلاری اور کیٹی نے پولیس کو بتایا کہ یہ تین ڈاکو انہیں لوٹنے کے لیے ڈبے میں آگھسے تھے اور پھر ایک چڑیل نے آکر ان کی جان بچائی۔

پولیس نے تینوں ڈاکوؤں کو پکڑ کر ہتھکڑیاں لگا دیں اور رام دُلاری اور کیٹی سے پوچھا۔

"چڑیل تو خیر یہاں کہیں سے بھی نہیں آسکتی۔ یہ بتائیں کہ آپ میں سے کس نے ان ڈاکوؤں کو بہادری سے کام لیتے ہوئے نیچے گرایا ہے؟"

رام دُلاری نے کہا۔

"سنتری جی! یہاں چڑیل آگئی تھی۔ وہ نظر نہیں آتی تھی جی۔ بس غیبی مُکے مارتی تھی"

سکھ گارڈ مسکرایا۔

"بی بی تم آرام کرو۔ خوف کی وجہ سے تمہارے دماغ پر اثر ہوگیا ہے"

پھر اس نے ٹرین سے باہر نکلتے ہوئے اپنے ساتھی سکھ تھانیدار سے کہا۔

"وہ اس عورت کے دماغ کے کچھ پرزے ڈھیلے ہوگئے

ہیں۔ بھلا کبھی ٹرین میں بھی کوئی چڑیل آتی ہے۔ ہا ہا ہا۔ کتنے جاہل ہوتے ہیں یہ امیر لوگ بھی ——"

وہ ہنستا ہوا ڈبے سے باہر نکلا ہی تھا کہ ماریا نے اس کی گردن پر ایک مُکا مار دیا۔ سکھ گارڈ دھڑام سے نیچے ریلوے لائن پہ گر پڑا۔ ماریا نے اس کے کان کے پاس آکر کہا۔

"چڑیلیں ریل گاڑی میں بھی سفر کرتی ہیں"

سکھ گارڈ اپنی پگڑی سنبھالتا ہوا اٹھا اور اپنے ڈبے کی طرف سیٹی بجاتا بھاگا۔ ڈبے میں جاتے ہی وہ غش کھا کر گر پڑا۔ اور ٹرین آگے روانہ ہوگئی۔

رام دُلاری کا سارا زیور بچ گیا تھا۔ وہ بڑی خوش تھی۔ اس نے کیٹی سے کہا۔

"دیکھا چڑیل میری مدد کو آگئی تھی۔ اصل میں یہ چڑیل نہیں تھی۔ کالی ماتا تھی۔ میں کالی جی کی پوجا کیا کرتی ہوں۔ وہ مجھے مشکل میں دیکھ میری مدد کرنے آگئی تھی —— ہاں —— وہ میری مدد کرنے آگئی تھی ——"

کیٹی نے کہا۔

"اچھا بابا آگئی ہوگی —— میں کہاں انکار کرتی ہوں۔ مگر اب خاموش ہو کر سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے"

رام دُلاری اپنے بچے کو دودھ پلانے لگی۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی۔ ابھی بچے کو دودھ پلاؤں گی پھر دیوی جی کی پوجا پاٹ کروں گی ——— ہاں"

کیٹی نے غسل خانے میں جا کر ماریا سے کہا۔

"اس کا کیا علاج کیا جائے ——— ہاں"

ماریا نے ہنس کر کہا۔

"کچھ نہیں۔ دلچسپ عورت ہے ——— ہاں"

صبح صبح ریل گاڑی امرتسر کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئی یہ بھارت کا آخری بڑا ریلوے سٹیشن اور بڑا شہر تھا۔ یہاں سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر پاکستان کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ رام دُلاری کیٹی کے گلے مل کر بولی۔

"بہن پامیلا! میرے گھر ضرور آنا۔ میں تمہیں دہی بھلّے کھلاؤں گی خود بنا کر ——— گائیں کی موری میں ہمارا مکان ہے۔ مکان نمبر ۱۴ ——— پتا جہازی مکان ہے۔ یاد رکھنا۔ گائیں کی موری ——— مکان نمبر ۱۴۔ جہازی مکان۔ دہی بھلّے ——— رام رام ———"

کیٹی نے کہا۔

"دہی بھلّے ——— خدا حافظ!"

ماریا یہ سارا تماشہ دیکھ رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔ وہ کیٹی کے ساتھ ریلوے سٹیشن سے باہر آ گئی۔ کیٹی کے

پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا اور ماریا کو ٹکٹ خریدنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ تو غائب تھی اور جہاں چاہے جا سکتی تھی۔

کیٹی کے پاس صرف ایک اٹیچی کیس تھا جس میں اس کے کپڑے اور دوسرا معمولی سا سامان تھا۔ اس نے ریلوے سٹیشن کے سامنے والے ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا اور غسل کرنے کے بعد کپڑے پہن کر ماریا کے ساتھ شہر کی سیر کو نکل گئی۔ ہوٹل میں اس نے یہی لکھوایا کہ وہ دلّی سے امرتسر کی سیر کرنے آئی ہے۔

دوپہر بارہ بجے تک وہ شہر کی سیر کرتی رہی۔ وہ امرتسر کی مشہور جگہ یعنی سکھوں کا مندر دربار صاحب دیکھنے بھی گئی۔ ماریا اس کے ساتھ تھی۔ یہ مندر ایک بہت بڑے تالاب کے درمیان میں واقع تھا۔ اس مندر میں سکھ لوگ بھجن وغیرہ گا رہے تھے۔ وہ دربار صاحب سے باہر نکلیں تو کیٹی کو ایک سکھ سی آئی ڈی والے نے روک لیا اور بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

"بی بی! تمہارا نام کیا ہے؟"

کیٹی نے سکھ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم کون ہو میرا نام پوچھنے والے؟"

سکھ نے کہا۔

"بی بی! میں سی آئی ڈی انسپکٹر ہوں"

اور اس نے جیب سے اپنا سرکاری شناختی کارڈ نکال کر کیٹی

کو دکھایا اور کہا۔

"بی بی! ہمارا کام ہی یہی ہے کہ اگر کسی پہ ذرا سا بھی شک پڑ جائے تو اس کی پوچھ گچھ ضرور کرتے ہیں"

"تو کیا تمہیں مجھ پر شک ہے کہ میں کوئی جاسوس ہوں؟"

سکھ انسپکٹر نے کہا۔

"بی بی! جاسوسوں کے سر پر سینگ نہیں لگے ہوتے وہ بھی ہماری تمہاری طرح کے ہوتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم کہاں سے آئی ہو؟"

کیٹی نے کہا۔

"میں ـــ میں دہلی سے امرتسر دیکھنے آئی ہوں، اور ـــ اور واپس دہلی چلی جاؤں گی"

سکھ انسپکٹر بولا۔

"کیا میں تمہارا شناختی کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟"

بھلا کیٹی کے پاس شناختی کارڈ کہاں تھا! کہنے لگی۔

"میرا شناختی کارڈ تو گھر پہ ہی رہ گیا ہے"

"یعنی 'دلی' میں رہ گیا ہے؟"

"جی ہاں دلی میں ـــ 'دلی' میں"

سکھ انسپکٹر کہنے لگا۔

"تو آپ نے فسٹ کلاس کی ٹرین میں ٹکٹ کیسے لے لی

تھی؟ فسٹ کلاس کا ٹکٹ تو شناختی کارڈ کے بغیر نہیں ملتا"

کیٹی سمجھ گئی کہ یہ ریلوے سٹیشن سے ہی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اس نے اسے فسٹ کلاس کے ڈبے سے باہر نکلتے دیکھا تھا۔ کیٹی نے کہا۔

"ارے بھائی لے لیا ٹکٹ بغیر شناختی کارڈ کے۔ پھر کون سی قیامت آگئی ہے ـــ"

سکھ انسپکٹر کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے کیٹی کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"بی بی! تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا"

کیٹی نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"چھوڑ دو میرا ہاتھ ـــ خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔ یہاں سے چلے جاؤ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی"

سکھ انسپکٹر نے اشارہ کیا۔ چھ سکھ سپاہی عام شہری لباس میں ادھر اُدھر سے نکل آئے اور انہوں نے کیٹی کو پکڑ کر اسے ہتھکڑی لگا دی۔ سکھ انسپکٹر بولا۔

"اگر اب بھی تم مجھے بتا دو کہ تم کون ہو؟ کس ملک کے لیے جاسوسی کر رہی ہو تو میں تمہیں بچا سکتا ہوں"

ماریا قریب کھڑی یہ سارا کھیل بڑی دلچسپی اور خاموشی سے دیکھ رہی تھی ـــ اس نے کیٹی کے کان میں آہستہ سے

سرگوشی کی۔

"تھانے چلو۔ ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ ہم شام کو سرحد پار کریں گے"

کیٹی نے کہا۔

"خدا کے لیے یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

سکھ نے چونک کر کیٹی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"اپنے آپ کو پاگل ثابت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہارا یہ حربہ کامیاب نہ ہو سکے گا کیونکہ ہمارے پاس ایسے آلات بھی ہیں کہ سارا پاگل پن نکال کر باہر رکھ دیتے ہیں۔ اس لیے خاموشی سے تھانے چل کر اپنا بیان لکھ کر بتا دو کہ تم پاکستان کی جاسوس ہو اور تمہیں پاکستان نے انڈیا میں جاسوسی کرنے کے لیے بھیجا ہے"

کیٹی نے کہا۔

"چلو ـــ تھانے چل کر بتاتی ہوں"

سکھ انسپکٹر نے سپاہیوں سے کہا۔

"اس کی ہتھکڑی کھول دو اور ویسے اسے زبردست پہرے میں رکھو۔ اور تھانے لے چلو"

تھانے میں سکھ انسپکٹر نے کیٹی کو سی آئی ڈی کے آئی جی یعنی انسپکٹر جنرل کے آگے پیش کر دیا اور اسے کہا کہ یہ پاکستانی

جاسوسہ ہے اور مجھے بڑی خطرناک جاسوسہ لگتی ہے۔

سکھ آئی جی کا چہرہ بڑا ڈراؤنا اور بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے کیٹی کی طرف گھور کر دیکھا۔ پھر اٹھ کر اس کے پاس آیا اور بولا۔

"یہ عینک تو اتارو پاکستانی جاسوسہ"

کیٹی نے کہا۔

"میں عینک نہیں اتار سکتی"

سکھ آئی جی نے کہا۔

"تو میں اتار دیتا ہوں تمہاری عینک پاکستانی جاسوسہ"

اور اس نے ایک ہی جھٹکے سے کیٹی کی عینک اتار دی۔ اب جو اس نے کیٹی کی چوکور آنکھیں دیکھیں تو دم بخود ہو کر رہ گیا۔

"ارے ـــ یہ کیا۔ اس کی تو چوکور آنکھیں ہیں؟"

سکھ انسپکٹر جو پاس ہی کھڑا تھا۔ بولا۔

"سر! یہ بڑی خطرناک جاسوسہ ہے۔ پاکستانی ڈاکٹروں نے اس کی آنکھوں کی پلاسٹک سرجری کرا کر یہاں بھیجا ہے کہ لوگ ڈر جائیں"

کیٹی اس سکھ انسپکٹر کی ہوشیاری پر عش عش کر اٹھی۔ کم بخت یہ خیال پہلے کسی کو بھی نہیں آیا تھا۔ اب تو سکھ آئی جی کا سارا خوف دگنا ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"اس پاکستانی جاسوسہ کو حوالات میں بند کر دو۔ ابھی اس کی خبر لیتا ہوں۔ اس کا باپ بھی کہے گا کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں"

کیٹی نے عینک دوبارہ لگا لی۔ اسے ہتھکڑی لگا دی گئی اور حوالات میں بند کر دیا۔ کیٹی نے دیکھ لیا تھا کہ سکھ آئی جی کے کمرے میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی تصویر لگی ہوئی تھی جو مر چکا تھا۔ اس نے حوالات میں جاتے ہی ماریا کی خوشبو محسوس کی اور کہا۔

"ماریا! تم بہت تنگ کرتی ہو مجھے۔ تم کھڑی کیوں تماشہ دیکھتی رہتی ہو۔ آخر تمہیں یہاں سے نکلنا نہیں ہے کیا؟" ماریا نے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ وہ تمہاری چمکو دار آنکھیں دیکھ کر ڈر جائے گا مگر وہ کم بخت تو بالکل نہیں ڈرا۔ بلکہ اس نے تو ایسی بات کہہ دی ہے کہ جو پہلے کسی کے دماغ میں نہیں آئی تھی کہ تمہاری آنکھوں کی پلاسٹک سرجری کرائی گئی ہے۔"

ماریا ہنس رہی تھی اور کیٹی کو اس کی ہنسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے غصے میں آ کر کہا۔

"اچھا دیکھو میں ابھی ان کی کیسی خبر لیتی ہوں کہ ان کو نانی یاد آ جائے گی۔"

"تم کیا کرو گی؟" ماریا نے پوچھا۔

کیٹی نے کہا۔

"میں پنڈت جواہر لعل نہرو بن رہی ہوں۔"

ماریا نے کہا۔

"خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ وہ تو مر چکا ہے۔ اگر کچھ تماشہ دکھانا ہے تو اندرا گاندھی بنو۔ وہ تو زندہ ہے اور بھارت کی وزیر اعظم ہے۔"

کیٹی اس سے پہلے ایک بار ایسا کر چکی تھی۔ اس نے کہا۔

"بہت اچھا۔ ابھی لو۔"

اس کو اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند کی شکل پوری طرح یاد تھی۔ اس نے اس شکل کو ذہن میں لا کر چٹکی بجا دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ کیٹی کی بجائے اندرا گاندھی بن گئی تھی۔ وہی سر کے سیاہ بالوں میں ابھری ہوئی سفید بالوں کی لکیر اور ساڑھی بندھی ہوئی۔

حوالات کے باہر جو سپاہی کھڑے تھے انہوں نے جو حوالات میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو دیکھا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کیٹی نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہاں کس نے بند کیا ہے؟ نکالو مجھے یہاں سے۔ دروازہ کھولو۔ میں ابھی تمہاری ایک ایک کی خبر لیتی ہوں۔"

سپاہی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ڈر سے کانپ رہا

تھا۔ اس نے جلدی سے حوالات کا دروازہ کھول دیا۔ کیٹی سیدھی انسپکٹر جنرل سی۔ آئی۔ ڈی کے کمرے میں چلی گئی۔ سکھ آئی جی نے جو اپنے سامنے ملک کی وزیر اعظم اندرا گاندھی کو دیکھا تو کرسی سے ایک دم اچھل پڑا اور ہاتھ باندھ کر لیا۔

"شریمتی جی آپ؟"
کیٹی نے غصّے میں کہا۔

"اور نہیں کیا تمہاری ماں؟ —— بدبخت فوراً میرے لیے گاڑی کا بندوبست کر!"
اس کو تو اپنی پڑ گئی تھی۔ فوراً گاڑی لانے کا حکم دیا اور بولا:
"شریمتی جی —— آ —— آ —— آپ تشریف لائیں۔ یہ —— ہماری خوش قسمتی ہے ——"
کیٹی نے بات کاٹ کر کہا۔

"بکواس بند کرو اور حوالات میں جتنے قیدی ہیں سب کو رہا کر دو۔ جلدی کرو نہیں تو میں ابھی تمہیں ڈسمس کرتی ہوں"

"جو حکم شریمتی جی!"
آئی جی نے تھر تھراتی زبان میں کہا اور فوراً حکم دیا کہ مردانہ حوالات کے سارے قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ جب سارے قیدی تھانے سے رہا ہو کر بھاگ گئے تو کیٹی نے کہا۔

"اب سکھ انسپکٹر پولیس کو بلاؤ"
یہ وہی سکھ انسپکٹر تھا جس نے کیٹی کو گرفتار کیا تھا۔ اس نے جو کمرے میں اندرا گاندھی کو دیکھا تو حواس کھو بیٹھا۔ کیٹی نے کہا۔

"مرغا بن جاؤ —— بن جاؤ مرغا"
انسپکٹر جنرل نے سکھ انسپکٹر کو ڈانٹ کر کہا۔
"بن جاؤ مرغا —— میں تمہیں حکم دیتا ہوں"
اور سکھ انسپکٹر اسی وقت مرغا بن گیا۔ کیٹی نے کہا۔
"اس کی پیٹھ پہ اینٹیں رکھو"
اسی وقت سپاہیوں نے اینٹیں لا کر سکھ انسپکٹر کی پیٹھ پر رکھ دیں اور اس کا برا حال ہونے لگا۔ کیٹی نے اکڑتے ہوئے کہا۔

"میں گورنر کے پاس جا رہی ہوں۔ جب تک میں تمہیں وہاں سے فون نہ کروں اس کو کان پکڑوائے رکھنا اور مرغا بنائے رکھنا۔ سمجھے؟"
انسپکٹر جنرل پولیس نے سیلوٹ مار کر کہا۔
"جو حکم شریمتی جی!"
کیٹی تھانے سے باہر آ گئی۔ سارے سپاہی ایک طرف لائن باندھ کر کھڑے تھے۔ انہوں نے "اندرا گاندھی زندہ باد" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ باہر ایک شاندار کار کھڑی تھی جس کے آگے ڈرائیور

بیٹھا تھا۔ کیٹی اس میں سوار ہو گئی۔ انسپکٹر جنرل نے دروازہ بند کر کے ایک بار پھر سیلوٹ کیا۔ سارے سپاہی سیلوٹ کئے کھڑے تھے۔ کیٹی نے ڈرائیور سے کہا۔

"گورنر ہاؤس چلو"

اور گاڑی تھانے سے باہر نکل گئی۔

"اندرا گاندھی" کے جانے کے بعد انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی نے سر کھجاتے ہوئے حوالات میں جھانکا اور سپاہی سے پوچھا۔

"وہ پاکستانی جاسوسہ کہاں ہے؟"

سپاہی نے گڑگڑاتی زبان میں کہا۔

"سر وہ تو غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی آ گئی تھیں"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"سر میں جھوٹ نہیں بول رہا سر!"

اور سپاہی رونے لگا۔

"سر میں بے گناہ ہوں۔ میں نے پاکستانی جاسوسہ کو نہیں بھگایا۔ وہ اندرا گاندھی بن گئی تھی سر!"

ادھر اندرا گاندھی یعنی کیٹی شاندار گاڑی میں بیٹھی تھی اور گاڑی امرتسر کے بازاروں سے گزر رہی تھی۔ لوگوں نے اپنے ملک کی وزیر اعظم کو دیکھا تو جلوس بنا کر اس کے پیچھے ہو گئے اور نعرے

لگانے لگے۔

کیٹی نے آہستہ سے ماریا سے کہا۔ "ماریا!"

ماریا نے کہا۔

"مزا آ گیا۔ مان گئی تمہیں۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

کیٹی نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اسی طرح مجھے سرحد عبور کر جانی چاہیئے۔ کیا خیال ہے"

ماریا بولی

"بڑا نیک خیال ہے۔۔۔"

کیٹی نے اندرا گاندھی کے روپ میں ڈرائیور سے کہا۔

"ڈرائیور۔ واہگہ سرحد کی طرف چلو۔"

"یس شریمتی جی!"

ڈرائیور نے ادب سے کہا اور گاڑی جی ٹی روڈ پر ڈال دی۔ واہگہ کی سرحد جہاں بھارت کا ملک ختم ہو جاتا تھا وہاں سے سولہ سترہ میل تھی۔ شہر میں شور مچ گیا تھا کہ اندرا گاندھی بھارت کی وزیر اعظم سرحد کی طرف جا رہی ہیں۔ شہر کے انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی نے ڈپٹی کمشنر کو فون کر دیا کہ جو عورت اندرا گاندھی کا روپ بدل کر سرحد کی طرف جا رہی ہے وہ کوئی جادوگرنی ہے اور اصل اندرا گاندھی نہیں ہے۔ ڈپٹی کمشنر حیران رہ گیا کہ

یہ آئی جی کیا سنا رہا ہے۔

„سر! میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔ آپ دلی فون کر کے پتہ کر لیں"

ڈپٹی کمشنر نے اسی وقت نئی دلی فون کر کے معلوم کیا کہ بھارتی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی پنجاب کے دورے پر آئی ہیں کیا؟ اُدھر سے جواب ملا کہ پاگل ہو گئے ہیں آپ؟ وزیرِ اعظم اندرا گاندھی تو اس وقت اپنی سرکاری رہائش گاہ میں روس کے سفیر سے ملاقات کر رہی ہیں۔ ڈپٹی کمشنر نے فوراً باڈر پر فون کر دیا کہ جو عورت اندرا گاندھی کا روپ بدل کر آرہی ہے وہ کوئی بہروپن ہے اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔

لیکن وزیرِ اعظم کو گرفتار کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ جب کیٹی کی گاڑی سرحد پر پہنچی تو باڈر پر پولیس اور فوج اسے گرفتار کرنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ مگر گاڑی رُکی۔ کیٹی اندرا گاندھی کی شکل میں باہر نکلی۔ اور کڑک کر بولی۔

„تم لوگوں نے میرے استقبال کا بندوبست کیوں نہیں کیا؟"

کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ آگے بڑھ کر اسے گرفتار کرے۔ کیونکہ اندرا گاندھی کی ہو بہو شکل اندرا گاندھی کی تھی۔ ذرا سا بھی فرق نہیں تھا۔ فوج کے کیپٹن نے امرتسر کے ڈپٹی کمشنر کو دوبارہ فون کیا۔ اور کہا۔

„سر! وہ تو بالکل بھارتی وزیرِ اعظم ہیں۔ آپ ایک بار پھر غور کر لیں۔ کہیں ہمیں نوکریوں سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں"

ڈپٹی کمشنر نے دوبارہ دلی فون کر کے وہی بات دہرائی تو سیکرٹری نے کہا۔

„معلوم ہوتا ہے امرتسر کی گرمی نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ارے احمق! اندرا گاندھی ابھی ابھی میرے کمرے سے ہو کر گئی ہیں۔ وہ ایک منٹ میں واہگہ سرحد پر کیسے پہنچ سکتی ہیں؟"

ڈپٹی کمشنر نے باڈر فوج کے کیپٹن کو فون پر کہا۔

„اسے گرفتار کر لو۔ وہ تو بہروپیہ عورت ہے"

„او کے سر!"

کیپٹن جلدی سے باہر نکلا۔ اندرا گاندھی اس وقت گارڈ آف آنر کا معائنہ کر رہی تھی۔ کیپٹن نے پستول نکالا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا رُخ اندرا گاندھی کی طرف کر کے کہا۔

„شریمتی —— شریمتی جی۔ میں آپ کو —— آپ کو ——"

„گرفتار کرنا چاہتے ہو بدبخت؟"

کیٹی نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

„احمق کیپٹن غور سے سنو! میں اصلی اندرا گاندھی ہوں بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں اپنا یہاں آنا کسی

پھر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی چنانچہ میں ایک اپنی ہم شکل عورت کو اندرا گاندھی بنا کر پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ اب بولو۔ کیا کہتے ہو؟ میں تمہیں ابھی اسی وقت ڈس مس کرتی ہوں"

کیپٹن نے پستول پھینک دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"شریمتی جی! مجھ سے بھول ہو گئی۔ مجھے معاف کر دیں"

"اچھا جاؤ معاف کیا ——"

بھارتی کیپٹن نے زبردست سیلوٹ مارا اور کیتھی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کیتھی گارڈ کا معائنہ کر رہی تھی۔ پھر اس نے گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے کہا۔

"بارڈر کا پھاٹک کھول دو۔ ہم پاکستان کا ایک روزہ خفیہ دورہ کرنے جا رہے ہیں"

"جو حکم وزیر اعظم صاحبہ"

کیپٹن اسی وقت پھاٹک کا دروازہ کھلوا دیا اور کیتھی بھارتی وزیر اعظم کے روپ میں بڑے ٹھاٹھ سے کار میں سوار ہندوستان کی سرحد پار کر کے پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ ماریا نے کہا۔

"بہت خوب۔ تم پاس ہو گئی ہو کیتھی"

کیتھی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آگے آگے دیکھنا ذرا"

ماریا کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے کیتھی پاکستان پہنچ کر یہ ڈرامہ بند کر دیں"

"او کے"

وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ پاکستانی سرحد پر آ کر کیتھی نے کار رکوا لی۔ وہ باہر آ گئی اور ڈرائیور سے بولی۔

"تم واپس چلے جاؤ گاڑی لے کر"

ڈرائیور نے سر جھکا کر کہا۔

"او کے میڈم!"

اور کیتھی پیدل چل کر پاکستانی بارڈر کے پاس آ گئی۔ وہاں کسٹم کے اعلیٰ افسروں نے جو بھارتی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کو آتے دیکھا تو حیران ہو کر رہ گئے کہ بغیر کسی اعلان کے ہمسایہ ملک کی وزیر اعظم وہاں کیسے آ گئی۔ بہر حال انہوں نے بڑے تپاک سے اندرا گاندھی یعنی کیتھی کا استقبال کیا اور وی، پی پی روم میں لے گئے اور لاہور میں ڈپٹی کمشنر اور اعلیٰ سرکاری حکام کو فون پر بتایا کہ بھارتی وزیر اعظم بارڈر پر آئی ہوئی ہیں۔

سارے افسران حیران ہوئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ بارڈر کی طرف بھاگے۔ اتنے میں کیتھی نے ڈرامہ بند کرنے کا فیصلہ کیا اور کسٹم کے افسروں سے کہا۔

”میں ذرا باہر درختوں کی کھلی ہوا میں سیر کرنا چاہتی ہوں، میرے ساتھ کوئی نہ آئے۔“

بھلا کون انکار کر سکتا تھا۔ کیٹی اٹھ کر باہر درختوں میں آگئی اور ایک بڑے درخت کی اوٹ میں جا کر اس نے اپنی شکل سامنے ا کر چٹکی بجائی اور پھر سے کیٹی بن گئی۔

ماریا۔ انارکلی میں

کیٹی نے آہستہ سے کہا۔

”ماریا — کیا تم میرے پاس ہو؟“

”ہاں کیٹی — میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

کیٹی چلی۔

”اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے“

اور کیٹی درختوں کے پیچھے سے ہو کر ایک چھوٹا سا چکر اٹ کر سڑک پر آگئی۔ سڑک پر کئی افسروں کی گاڑیاں بھارتی وزیر اعظم کے استقبال کے لیے آ رہی تھیں — کیٹی نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ وہ ایک بس میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ ماریا بھی اس کے ساتھ تھی۔

اب رات ہو گئی تھی۔ لاہور شہر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر کیٹی بس سے اتر آئی۔ ماریا کی خوشبو اسے برابر آ رہی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ماریا اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ کیٹی نے ایک طرف ہو کر ماریا سے کہا۔

"ہمارا پروگرام گارڈن ٹاؤن جا کر اپنے پرانے دوست طالب علم امجد سے ملنے کا ہے تاکہ اس سے عنبر ناگ کے بارے میں کچھ پوچھ سکیں۔ لیکن اس وقت رات ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے رات کسی ہوٹل میں بسر کرتے ہیں۔ صبح اللہ کر امجد کی کوٹھی جائیں گے۔"

ماریا نے کہا۔

"ہمیں رات کیا کہتی ہے۔ میری تو رائے یہ ہے کہ ہمیں ابھی گارڈن ٹاؤن جا کر امجد سے ملنا چاہیئے"

"جیسے تمہاری مرضی"

کیٹی نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اسے گارڈن ٹاؤن چلنے کو کہا۔

ٹیکسی ریلوے سٹیشن کے احاطہ سے نکل کر گارڈن ٹاؤن کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ شہر میں رونق تھی۔ کیٹی اور ماریا دونوں کو امجد کی کوٹھی کا پتہ معلوم تھا۔ کوٹھی کے قریب جو نالہ کا چھوٹا سا پل تھا۔ وہاں پہنچ کر کیٹی نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر واپس بھیج دیا اور ماریا سے کہا۔

"میرا خیال ہے ماریا تم اکیلی جا کر امجد کو یہاں بلا لاؤ۔ میں گئی تو خواہ مخواہ اس کے گھر والوں کو شبہ پڑ جائے

گا کہ خدا جانے کیا بات ہے جو میں اسے رات کو ملنے آئی ہوں"

"اچھا۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں امجد کو بلا لاتی ہوں"

اور ماریا امجد کی کوٹھی کی طرف چل پڑی۔ اس وقت کوٹھی میں رات کا کھانا میز پر لگایا جا رہا تھا۔ اتفاق سے امجد کوٹھی کے برآمدے میں ہی مل گیا۔ وہ اپنے سکوٹر کو کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔ ماریا خاموشی سے اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ امجد اپنے کام میں لگا ہوا تھا کہ اچانک اس کے ناک میں ماریا کی خوشبو آنے لگی۔ اس نے حیران ہو کر آس پاس دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ مگر خوشبو برابر آ رہی تھی۔

امجد نے آہستہ سے کہا۔

"ماریا؟ کیا یہ تم ہو؟"

"ہاں" ماریا نے سرگوشی میں کہا۔

امجد ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کپڑے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں کیسے آ گئیں ماریا؟"

عین اس وقت امجد کا باپ قریب سے گزرا اور رک کر بولا۔

"امجد یہ تم اکیلے کھڑے کس سے باتیں کر رہے ہو؟"

امجد فوراً سنبھل گیا اور کھسیانا سا ہو کر بولا۔

"کسی سے نہیں ڈیڈی ——— وہ ——— وہ دراصل میں ایک فلمی گیت گنگنانے کی کوشش کر رہا تھا"

اس کے ڈیڈی نے کہا۔

"تو پھر ایسی کوشش نہ کیا کرو۔ کیونکہ تم فلمی گیت گنگناتے ہوئے ایسے لگتے ہو جیسے کسی سے باتیں کر رہے ہو۔ چلو اب کھانا کھا لو آمدہ آ کر"

"اچھا ڈیڈی ——— میں آ رہا ہوں"

جب امجد کا ڈیڈی کمرے میں چلا گیا تو ماریا نے کہا۔

"امجد! میرے ساتھ کیتھی بھی ہے"

"کہاں ہے کیتھی بہن؟" امجد اشتیاق سے بولا۔

"پل پر تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم وہاں آؤ، میں بھی وہیں چلتی ہوں"

امجد کوٹھی کے لان میں سے نکل کر نالے کے پل پر آ گیا۔ وہاں کیتھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ امجد بڑی گرم جوشی سے ملا اور عنبر اور ناگ کا پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ وہ اس سے ملنے کیوں نہیں آئے؟

کیتھی نے کہا۔

"ہم عنبر اور ناگ کا ہی پوچھنے تمہارے پاس آئے

ہیں۔ کیا تم نے انہیں کہیں دیکھا ہے؟"

امجد نے کہا۔

"بھلا میں یہاں رہ کر انہیں کہاں دیکھ سکتا ہوں۔ بھئی آپ لوگ تو صدیوں کے مسافر ہیں۔ کبھی بابل میں تو کبھی ملک روم کے شاہی قلعوں میں ہوتے ہیں۔ آپ سے تو قسمت کے ساتھ ہی ملاقات ہو سکتی ہے"

پھر کیتھی نے امجد کو پچھلی ساری کہانی سنائی اور بتایا کہ ناگ اور عنبر ان سے بچھڑ چکے ہیں۔

"ہم نے سوچا کہ لاہور چل کر تم سے ملتے ہیں شاید ناگ اور عنبر کا کوئی سراغ مل سکے"

امجد بولا۔

"کیتھی بہن! جب سے میں تم لوگوں کے ساتھ صدیوں کے سفر کی سیر کر کے آیا ہوں پھر نہ تم سے ملاقات ہوئی اور نہ انکل ناگ اور عنبر سے ملا ———"

کیتھی اور ماریا کو اگرچہ مایوسی ہوئی تھی لیکن انہوں نے امجد کو تاکید کی کہ ابھی وہ لاہور میں ہی ہیں، اگر عنبر یا ناگ کا کوئی پتہ چلے تو انہیں ضرور اطلاع کر دے۔ امجد نے کہا۔

"تم کہاں ٹھہرو گی کیتھی بہن؟ میرے ہاں کیوں نہیں ٹھہر جاتیں؟"

کیٹی نے کہا۔

"تمہاری دعوت کا شکریہ امجد! لیکن ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے ڈیڈی ہمیں پسند نہیں کریں گے۔ کیونکہ ہم انہیں اپنے سفر پہ لے جاتے ہیں جو ایک خطرناک بات ہے۔"

امجد نے کہا۔

"ہاں —— ڈیڈی کو فکر تو ہوتی ہے مگر وہ انکل عنبر اور ناگ کا بڑا احترام کرتے ہیں"

ماریا بولی۔

"نہیں امجد بھیا! ہمارا تمہارے ہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ ہم لاہور کے کسی بھی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گی اور بس"

امجد نے کہا۔

"آپ مجھے ابھی بتا دیں کہ کس ہوٹل میں ٹھہریں گی۔ تاکہ اگر عنبر اور انکل ناگ کا کوئی سراغ ملے تو میں انہیں لے کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں؟"

کیٹی بولی۔

"ابھی ہم نے فیصلہ نہیں کیا کہ کس ہوٹل میں ٹھہریں گی میں تمہیں ٹیلی فون پہ بتا دوں گی"

"یہ ٹھیک ہے میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا"

کیٹی نے امجد کی کوٹھی کا فون نمبر لکھ لیا اور اسے خدا حافظ

کہہ کر واپس چل پڑیں۔ کیٹی نے ماریا سے کہا۔

"ہوٹل انٹر کونٹی نینٹل اور انٹر نیشنل میں پہلے ہی ڈرامہ کر چکی ہوں۔ اس لیے وہاں نہیں ٹھہریں گے"

ماریا بولی۔

"اور تم تو ہوٹل ہلٹن میں بھی ایک بار اندرا گاندھی بن چکی ہو —— وہاں بھی نہیں جاؤ گی"

"ہاں —— وہاں بھی جانا مناسب نہیں۔ میرا خیال ہے اس بار ہم کوئی دوسرا ہوٹل تلاش کرتی ہیں"

ماریا نے کہا۔

"لاہور ہوٹل کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

کیٹی کہنے لگی۔

"ہاں۔ وہ ہوٹل ٹھیک رہے گا۔ غریبانہ سا ہوٹل ہے۔ ہمیں دو ایک دن ہی تو گزارنے ہیں"

وہ سڑک پر آ کر ٹیکسی کا انتظار کرنے لگیں۔

اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے، اور سڑک سنسان ہونے لگی تھی۔ اچانک ایک رکشا ان کے قریب سے گزرا جس میں سے ایک عورت کے چلانے کی آوازیں آئیں۔

"خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ یہ مجھے قتل کر دیں گے۔ مجھے بچاؤ لوگو!"

کیٹی نے کہا۔

"ماریا۔ اس عورت کو بچانا چاہیئے"

ماریا بولی۔

"میں اس رکشے والے کو پکڑتی ہوں۔ تم میرے پیچھے آؤ"

اور ماریا زمین سے پانچ فٹ بلند ہو کر سڑک پر اڑتی ہوئی رکشے کے پیچھے بھاگی۔ تھوڑی دور جا کر وہ رکشے کے ساتھ مل گئی اس نے رکشا ڈرائیور کی گردن کو دبوچ کر آہستہ سے کہا۔

"رکشا روکو"

رکشا ڈرائیور ایک دم سے چونک پڑا کہ یہ کون غیبی شے آگئی ہے۔ اس نے وہیں بریک لگا دی اور بھوت بھوت کا شور مچاتا سڑک کے کنارے کے درختوں کی طرف بھاگ گیا۔

ماریا نے دیکھا کہ رکشے میں دو غنڈے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا اور انہوں نے ایک دبلی پتلی لڑکی کو دبوچ رکھا تھا۔

انہوں نے ماریا کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ بڑے حیران ہوئے کہ رکشے والے کو کیا ہو گیا ہے کہ ایک دم سے رکشا روک کر بھوت بھوت کا شور مچاتا بھاگ گیا ہے۔ وہ جلدی سے رکشے میں سے نکل آئے۔ انہوں نے لڑکی کے منہ میں رومال ٹھونس

تھا اور اب اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے سڑک کے نیچے کچے راستے پر سے آئے جہاں گھنی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ یہاں آ کر غنڈے نے لڑکی کی گردن پر پستول رکھ کر کہا۔

"کلمہ پڑھ لے۔ تیرا آخری وقت آگیا ہے"

ماریا لپک کر اس غنڈے کے سر پر پہنچ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ پستول سے فائر کرے اس نے ایک زوردار لات ایسی ماری کہ غنڈا قلابازیاں کھاتا درختوں میں دور تک چلا گیا۔ اور پستول نیچے زمین پر گر پڑا۔ ماریا نے پستول اٹھا لیا جو اس کے ہاتھ میں آتا ہی غائب ہو گیا۔

اتنے میں کیٹی بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے لڑکی کے منہ سے کپڑا نکالا اور کہا۔

"گھبراؤ نہیں بہن!"

دوسرے غنڈے نے ایک دم سے چھرا نکالا اور کیٹی پر حملہ کر دیا۔ اگر کیٹی اُچھل کر پرے نہ ہو جاتی تو چھری اس کے سینے میں اتر گئی تھی۔ ماریا نے پیچھے سے آ کر اس غنڈے کے بازو پر اتنی زور سے ہاتھ مارا کہ اس کے بازو کی ہڈی دو ٹکڑے ہو گئی اور وہ ہائے کہہ کر نیچے گر پڑا۔ کیٹی نے کہا۔

"ماریا! ان دونوں کو چھوڑو۔ پہلے اس لڑکی کو اس کے گھر پہنچاتے ہیں"

لڑکی پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ ماریا نے کہا۔

"جو لوگ عورتوں پر ظلم کرتے ہیں اور انہیں قتل کرتے ہیں۔ میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم اس لڑکی کو لے کر سڑک پر کوئی ٹیکسی روکو میں ان غنڈوں کو ہلاک کر کے آتی ہوں"

کیتھی نے کہا۔

"نہیں ماریا! اب ہمیں ان کو مارنے کا کوئی حق نہیں۔ آؤ میرے ساتھ"

اور ماریا مجبوراً کیتھی کے ساتھ چلتی ہوئی سڑک پر آگئی۔

لڑکی کو اب کافی ہوش آچکا تھا۔ اس نے کیتھی کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"بہن جی! تم فرشتہ بن کر آگئی ہو۔ تم نے میری جان بچا لی۔ نہیں تو یہ غنڈے مجھے نہ چھوڑتے"

لڑکی کو ماریا کی موجودگی کا احساس تک نہیں تھا۔ کیتھی نے پوچھا۔

"یہ لوگ تمہیں کہاں سے اغوا کر کے لا رہے تھے؟"

لڑکی نے کہا۔

"میں اپنی خالہ کے ہاں گئی ہوئی تھی کہ انہوں نے پستول اور خنجر دکھا کر مجھے خالہ کے گھر سے اغوا کر لیا ——"

"اب تم کہاں جانا چاہتی ہو؟" کیتھی نے پوچھا۔

لڑکی بولی۔

"آپ مجھے میرے گھر میوہ منڈی پہنچا دیں"

کیتھی نے کہا۔

"میوہ منڈی —— جو لاہور ہوٹل کے پاس ہے؟"

"ہاں میں وہیں پریم گلی میں اپنے چچا کے پاس رہتی ہوں۔ میرے باپ فوت ہو چکے ہیں"

کیتھی بولی۔

"میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔ چلو ہم تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیں گے"

لڑکی نے پوچھا۔

"کیا آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

کیتھی نے پوچھا۔

"یہ تمہیں کیسے احساس ہوا؟"

لڑکی بولی۔

"تم نے کہا نا کہ ہم تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیتے ہیں"

اب کیتھی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ماریا خاموشی سے ہنس رہی تھی۔

اس نے کہا۔

"ارے نہیں یونہی میرے منہ سے نکل گیا تھا"

بڑی مشکل سے ایک خالی ٹیکسی ملی جس میں بیٹھ کر کیٹی اور ماریا اس لڑکی کو لے کر میوہ منڈی آئے اور اسے اس کے چچا کے گھر پہنچا دیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد ماریا اور کیٹی لاہور ہوٹل میں آ گئیں۔ یہاں کیٹی نے ایک کمرہ کرائے پر لیا اور دروازہ اندر سے بند کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ ماریا اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی اور دونوں عنبر اور ناگ کے بارے میں گفتگو کرنے لگیں۔

◆

دوسرے روز انہوں نے فون پر امید کو اپنے ہوٹل اور کمرے کا نمبر بتایا اور سیر کرنے لاہور کی انار کلی میں گھومنے پھرنے لگیں۔ انار کلی میں بڑی رونق تھی۔ عورتیں خریداری کر رہی تھیں۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی۔ ایک جگہ چھوٹی سی دکان میں کرسیاں بچھی تھیں اور دو عورتیں بیٹھی پھلوں کا جوس پی رہی تھیں۔ کیٹی نے سرگوشی میں کہا۔

”پھلوں کا جوس پیو گی ماریا؟“

”اگر تم پیو گی تو میں بھی پی لوں گی“

کیٹی اس دکان کے قریب آئی تو ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر بلند آواز میں کہا۔

”آؤ آپا، سنگتروں کا جوس۔ کیلوں کا جوس دو روپے میں آپا جی!“

ماریا نے کیٹی سے پوچھا۔

”یہ آپاں جی کیا ہوتا ہے؟“

کیٹی ہنس کر بولی۔

”بڑی بہن کو آپاں کہتے ہیں یہاں۔“

اب ماریا نے مسکراتے ہوئے کیٹی سے کہا۔

”چلو آپاں کیٹی جی پھر بیٹھ کر جوس پیتے ہیں“

کیٹی مسکرانے لگی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے جوس کے دو گلاس منگوا لیے۔ ایک اپنے لیے اور ایک ماریا کے لیے۔ نوکر لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا۔

”آپاں جی! یہ دوسرا گلاس کس کے لیے ہے؟“

کیٹی نے کہا۔

”تمہاری تائی اماں کے لیے۔ بھاگو یہاں سے“

کیٹی کی ساتھ والی میز پہ ایک لڑکی بیٹھی اپنی سہیلی سے باتیں کر رہی تھی۔ اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ وہ لڑکی شیبا تھی۔ شیبا سے رہا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے عنبر کی طلسمی یاقوت والی انگوٹھی کی مدد سے تین ہزار سال پرانے زمانے میں جا کر ملکہ قلوپطرہ کو خودکشی کرتے اپنی آنکھوں سے

دیکھا تھا۔ پھر بھلا وہ کتنی دیر تک اس بات کو اپنے پیٹ میں رکھ سکتی تھی۔ یہ بات اُچھل اُچھل کر اس کے حلق میں آ رہی تھی اور وہ کسی نہ کسی کو اپنے "تاریخی سفر" کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ آخر اس نے اپنی ایک خاص سہیلی کو یہ راز بتانے کا فیصلہ کیا اور اسے لے کر بانو بازار کی جوس والی دکان پہ بیٹھ گئی۔ کیتھی چشمہ لگائے اس کے پاس ہی بیٹھی تھی مگر شیبا کو اس کا علم نہیں تھا۔ کیونکہ چشمے کی وجہ سے کیتھی کی چکور آنکھیں چھپی ہوئی تھیں۔ اگر اس کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو شیبا فوراً پہچان لیتی، کیونکہ اس نے عنبر ناگ ماریا کی واپسی کی کتابوں میں پڑھ رکھا تھا کہ کیتھی ایک خلائی لڑکی ہے اور اس کی آنکھیں چکور ہیں۔"

کیتھی اور ماریا نے بھی اس سے پہلے شیبا کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے انھوں نے بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ کیتھی کو یہ فکر پڑی تھی کہ کسی طرح سے ماریا سب کی آنکھ بچا کر اپنا جوس کا گلاس اٹھا کر پی لے۔ کیتھی اپنا جوس پی رہی تھی۔ ماریا نے جب دیکھا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا تو اس نے گلاس اٹھا لیا۔ گلاس ماریا کے ہاتھ میں جاتے ہی غائب ہو گیا۔ اتنے میں دکان کا نوکر لڑکا اندر آیا اور کیتھی کے آگے دوسرا گلاس غائب پا کر بولا۔

"آہاں جی! آپ نے جوس کے ساتھ گلاس بھی پی لیا ہے"
کیتھی نے غصّے سے اس کی طرف دیکھا اور لڑکا باہر بھاگ گیا۔

ماریا نے اب جوس پی کر گلاس میز پہ رکھ دیا تھا۔ کیتھی ہنسنے لگی۔ اتنے میں اس کے کانوں میں ساتھ والی میز پہ بیٹھی لڑکی کی آواز آئی۔ وہ اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی۔

"تم مجھ سے قسم لے لو۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی"

سہیلی نے کہا۔

"مگر شیبا! یہ کیسے ہو سکتا ہے"

شیبا بولی۔

"خدا کی قسم میرے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ میں نے ملکہ قلو پطرہ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے"

کیتھی چونکی۔ ماریا بھی ذرا چونکی تھی کہ یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے؟

سہیلی نے کہا۔

"تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہو گا"

شیبا نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

"سنو! کیا تم نے کبھی عنبر ناگ ماریا کی واپسی کی کوئی کتاب پڑھی ہے؟"

سہیلی نے کہا۔

"وہی جو اے حمید لکھ رہا ہے اور نیا مکتبہ اقرا والے چھاپ رہے ہیں؟"

"ہاں وہی —"

"میں نے اس کی تازہ قسطیں پڑھی ہیں"

شیبا نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر یقین کرو کہ میں نے اس کتاب کے ایک پیارے کردار عنبر کی مدد سے آج سے تین ہزار سال پہلے کے زمانے کی سیر کی ہے اور ملکہ قلو پطرہ کی خاص کنیز کے روپ میں اس کی خودکشی کا تاریخی منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟"

شیبا کی سہیلی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"شیبا تمہارے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہو گیا ہے۔ خدا کے لیے نیند لانے والی گولیاں کھا کر آج سارا دن اور ساری رات آرام کرو — چلو کالج سے دیر ہو رہی ہے —"

کیٹی اور ماریا نے یہ ساری گفتگو سنی تو گویا انہیں کھویا ہوا خزانہ مل گیا۔ ماریا تو بے اختیار بول اٹھی۔

"اس لڑکی کو بلاؤ —"

یہ آواز شیبا اور اس کی سہیلی نے بھی سن لی تھی۔ انہوں نے کیٹی کی طرف دیکھا۔ کیٹی شیبا کی سہیلی کے سامنے شیبا پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شیبا جلدی سے اپنی سہیلی کے ساتھ دکان سے باہر نکل گئی۔ ماریا نے کہا۔

"خدا کے لیے اس کا پیچھا کرو۔ اسے عنبر کا پتہ ہے یہ عنبر سے مل چکی ہے اور ہماری دنیا میں سفر کر چکی ہے۔ کہیں گم نہ ہو جائے بھیڑ میں —"

کیٹی نے دکان دار کو پیسے دیئے اور دکان سے باہر نکل آئی۔ اس نے عورتوں کی بھیڑ میں دیکھا۔ شیبا اپنی سہیلی کے ساتھ بازار میں چلی جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگی۔ اس نے ماریا سے کہا۔

"تم آگے جا کر شیبا کو نگاہ میں رکھو ماریا"

کیٹی کی آواز سن کر اس کے قریب ہی چلنے والی عورت نے چونک کر کہا۔

"آپ نے مجھے کچھ کہا بہن؟"

"نہیں نہیں بہن — میں — میں — کچھ نہیں —"

اور کیٹی جلدی سے آگے نکل گئی۔ ماریا عورتوں کے سروں کے اوپر سے گزرتی ہوئی آگے چلی گئی تھی مگر شیبا اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کہیں بھیڑ میں گم ہو گئی تھی۔ کیٹی

بانو بازار سے نکل کر اب انار کلی کے بازار میں آ گئی تھی۔ ماریا بھی اس کے پاس آ گئی۔

"شیبا کہاں ہے، کیتھی؟"

"میں نے تو تمہیں اس پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجا تھا ماریا"

"افسوس وہ بھیڑ میں کہیں غائب ہو گئی۔"

اور کیتھی پریشان ہو گئی۔ اس نے کہا۔

"خدا کے لیے پرانی انار کلی کی طرف دوڑو۔ وہ ادھر کو ہی گئی ہے"

کیتھی اور ماریا نے شیبا کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہر عورت کو گھور گھور کر تکتی۔ مگر شیبا انہیں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آخر وہ مایوس ہو گئیں۔ کیتھی نیلے گنبد کے ہسپتال کے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"ماریا ہم نے ایک ایسے گواہ کو کھو دیا ہے جو عنبر کے بارے میں کچھ بتا سکتی تھی ـــــ"

اچانک ماریا نے کہا۔

"وہ جا رہی ہے شیبا، ادھر ـ مسجد کے قریب ـ وہ سامنے پھل والی ریڑھی کے پاس"

کیتھی اس کی طرف بھاگی۔ مگر جب تک وہ شیبا کے پاس

شیبا اپنی سہیلی کے ساتھ رکشے میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو چکی تھی۔ کیتھی نے صرف اتنا ہی سنا کہ شیبا رکشے والے سے کہہ رہی تھی۔

"لاہور کالج چلو"

کیتھی واپس دیوار کے پاس آ گئی۔ کیونکہ ماریا کو وہ اسی جگہ چھوڑ گئی تھی۔ جہاں سے اسے ماریا کا [illegible] آیا تو وہ وہاں پر آہستے کہنے لگی۔

"وہ کسی لاہور کالج جا رہی ہے ماریا"

"تو پھر ہمیں بھی وہیں چلنا چاہیے۔ آؤ دوسرا رکشا کرا کر شیبا کا تعاقب کرتے ہیں۔ اس کا ملنا بہت ضروری ہے۔"

کیتھی نے ایک رکشا پکڑا۔ اس میں بیٹھ گئی۔ ماریا بھی اس کے ساتھ ہی سوار ہو گئی۔ کیتھی نے رکشا ڈرائیور سے پوچھا۔

"یہ لاہور کالج کدھر ہے؟"

ڈرائیور نے کہا۔

"لڑکیوں کا لاہور کالج؟"

"ہاں لڑکیوں کا؟"

"میں آپ کو لے چلتا ہوں"

اور رکشا ڈرائیور نے زوردار آواز کے ساتھ رکشا سٹارٹ کیا اور مال روڈ پر اترنے لگا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ چونکہ

چیرنگ کراس سے گھوم کر وہ کوئینز روڈ پر آگیا اور مزنگ چنگی سے فیروز پور روڈ کی طرف مڑ گیا۔ سارے رستے میں شیبا کہیں نظر نہ آئی تھی۔ اس کا رکشا اسے لاہور کالج چھوڑ کر واپس بھی جا چکا تھا۔ جب کیٹی کا رکشا لاہور کالج کے باہر درختوں کے نیچے رکا تو اس نے رکشا ڈرائیور کو کرایہ دے کر رخصت کر دیا اور خود کالج کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ کالج کی لڑکیاں گھوم پھر رہی تھیں۔ ماریا نے کہا۔

"اندر چل کر دیکھتے ہیں۔ یہاں تو وہ لڑکی شیبا کہیں دکھائی نہیں دے رہی"

"میں اندر جا رہی ہوں"

"میں تمہارے ساتھ چلوں" ماریا نے کہا۔

اور کیٹی کالج کے مین گیٹ میں سے گزر کر کالج کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ کالج کی کلاسیں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ لڑکیاں درختوں کے نیچے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کیٹی نے چل پھر کر ان ساری لڑکیوں کو غور سے دیکھا۔ کیٹی نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ ان لڑکیوں میں اسے شیبا کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

کیٹی نے درختوں کی طرف منہ کر لیا اور آہستہ سے کہا۔

"ماریا ——— ؟"

"شیبا یہاں بھی نہیں ہے"

ماریا بولی۔

"ایسا کرو۔ یہاں کسی لڑکی سے شیبا کے بارے میں معلوم کرو"

"اچھا خیال ہے" کیٹی مسکرائی۔

اس نے دیکھا کہ تین لڑکیاں بچھے ہوئے بنچ پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کیٹی ان کے قریب جا کر کہنے لگی۔

"کیوں بہن! یہاں شیبا نام کی لڑکی کس کلاس میں پڑھتی ہے؟"

لڑکیاں باتیں کرتیں خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے کیٹی کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ایک لڑکی نے کہا۔

"آپ کون ہیں؟ شیبا آپ کی کیا لگتی ہے؟"

کیٹی مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"میرا نام شکیلہ ہے۔ میں اس کی آنٹی ہوں"

ایک اور لڑکی بولی۔

"کمال ہے۔ آپ شیبا کی آنٹی ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں اور آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس کلاس میں پڑھتی ہے"

کیٹی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں ایک عرصے سے لندن میں تھی۔ آج ہی واپس

لاہور آئی ہوں۔ اتفاق سے ان کے گھر پہ کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کالج میں چل کر پتہ کرتی چلوں شاید شیبا مل جائے۔“

دوسری لڑکی نے کہا۔

”وہ فرسٹ ائیر۔ بی سیکشن میں ہے“

تیسری لڑکی نے برا سا منہ بنا کر دوسری لڑکی کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس اجنبی عورت کو شیبا کی کلاس کا پتہ بتلایا جائے۔ کیٹی نے اس لڑکی سے کہا۔

”میں تمہارا شکریہ تمہاری زبان میں ادا کروں یا اپنی زبان میں؟“

اس لڑکی نے مذاق کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم دوسری دنیا سے آئی ہو۔ جو تمہاری زبان دوسری ہو گی؟“

کیٹی نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں — میں دوسری دنیا سے آئی ہوں“

اور کیٹی نے اپنی زبان میں شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”خسی تائیو شوکاری انڈر —“

لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ ماریا نے آہستہ سے کہا۔

”کیٹی — وقت ضائع نہ کرو“

کیٹی نے مسکرا کر ان لڑکیوں کو ٹاٹا کہا اور فرسٹ ائیر کلاس کے بی سیکشن کو تلاش کرنے کے لیے کالج کے برآمدے میں آ گئی۔ ایک کمرے کے باہر A لکھا تھا۔ وہ برآمدے کا موڑ گھومی تو آگے کمرے پر B لکھا ہوا تھا۔ اندر لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ کلاس لگی ہوئی تھی اور ایک ادھیڑ عمر کی پروفیسر خاتون کتاب کھول کر پڑھ رہی تھیں۔ کیٹی نے کھڑکی میں سے ایک نگاہ ساری لڑکیوں پر ڈالی۔ اس نے شیبا کو پہچان لیا۔ وہ اپنی اسی بانو بازار والی سہیلی کے ساتھ کلاس روم میں بیٹھی تھی۔

لڑکیاں بھی کیٹی کو تکنے لگیں کہ یہ سیاہ چشمے والی عورت کون ہے۔ پروفیسر نے بھی کیٹی کو دیکھا اور دروازے کے پاس آکر کہا۔

”آپ کو کس کی تلاش ہے؟ یہاں کیوں گھوم رہی ہیں؟“

کیٹی نے کہا۔

”مجھے ایک لڑکی شیبا سے ملنا ہے۔ میں اس کی خالہ ہوں۔“

اتنا کہہ کر کیٹی برآمدے سے باہر چلی گئی۔ وہ شیبا کو کلاس روم سے باہر لانا چاہتی تھی۔ پروفیسر نے شیبا سے کہا کہ باہر اس کی خالہ آئی ہے۔ شیبا حیران ہوئی کہ اس کی خالہ کہاں سے آ گئی۔

کھڑکی کے شیشے میں سے اس نے کیٹی کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی اور وہ پہچان نہ سکی تھی کہ یہ اس کی خالہ ہے یا کوئی اور۔ شیبا کلاس روم سے باہر آ گئی۔

کیٹی ذرا پرے درخت کے نیچے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ شیبا برآمدے سے اتر کر اس کے پاس آئی اور تعجب سے دیکھنے لگی کیونکہ یہ اس کی خالہ نہیں تھی۔ اس نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

”آپ کب سے میری خالہ بن گئیں؟“

کیٹی مسکرائی۔ اس نے کہا۔

”میں تمہاری خالہ نہیں ہوں۔ یہ ٹھیک ہے مگر میں وہ لڑکی ہوں جس سے ملنا تم بہت پسند کرو گی۔“

”کیا مطلب؟“ شیبا نے پوچھا۔

کیٹی نے کہا۔

”میں عنبر ناگ ماریا سیریز کی خلائی لڑکی کیٹی ہوں۔“

اور اس کے ساتھ ہی کیٹی نے اپنی عینک اتار دی۔ کیٹی کی چکور آنکھیں دیکھ کر شیبا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔